حالات و خیالات

نثرانے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

نثرانے

حفیظ جالندھری

حالات وخیالات

ابوالاثر حفیظ جالندھری

مجلس اردو ۔ کتاب خانہ حفیظ لاہور

- اشاعت ——— بار اوّل ۱۹۷۶ء
- کتابت ——— نام کاتب کام کا نہیں
- طباعت ——— الجدہ پریس لاہور
- تعداد ——— ایک ہزار
- قیمت فی نسخہ ———

طلب فرمائیے، پاکستان کے ہر تاجر کتب سے

تاجران کتب اور ہر طالب کتاب لاہور میں حاصل کر سکتے ہیں

علاء الدّین مظہر ایوانِ اُردو وشنو گلی سنت نگر سے
مکتبہ جدید انارکلی لاہور سے

کراچی میں

نورسی پبلشرز مین روڈ لیاقت آباد سے

"شکایت ہو تو لکھیے۔"

بنام مہتمم مرکز شاہنامہ اسلام جی ۴۳-۴۴ ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

بنام ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا - پی ایچ ڈی

نثرانے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ کتاب

نثر کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو حالات کے مشاہدات اور تجربات سے پیدا
شدہ خیالات مجھ سے لکھواتے رہے۔ میری زندگی کا دائرہ کار اپنے گھر تک محدود نہیں تھا
سُنی ہوئی باتوں یا جرائد و اخبار کے صفحات کے مطالعہ پر میری قلم کاری یا گفتار کا انحصار نہیں رہا۔
میں ۱۹۰۰ سنہ سے اس معاشرہ کا رکن ہوں ہندو اور انگریز سے واسطہ رہ چکا ہے مشرق
و مغرب میری اُس نقابت سے محروم نہیں رہے جو مجھے علامہ اقبال سے احسان ہوئی۔
پاکستان کی تعمیر میں معمارِ اعظم کے چند خاص ادبی گارا بنانے اور اینٹ پتھر ڈھونے والے
مزدوروں میں ایک میں بھی کارندہ تھا تخریب کاروں کے مقابل شاید ہی کوئی علمی اور قلمی
محاذ ہو۔ جہاں بھی ملّت میری طالب ہوئی میں نے تامّل نہیں کیا۔ شعر شاعری ہی نہیں میں نے
نثری مضامین بھی اتنے لکھے اور شائع کئے جن کی یاد بھی اب علالت زدہ گنتیِ عمر سے
کھسک چکی ہے۔

یہ جو کچھ آپ کے پیشِ نظر کتابی صورت میں لایا گیا ہے اگر آپ نے ذرا غور سے
مطالعہ کیا تو تحریروں کے الفاظ میرے خونِ قلب و جگر سے اُمڈے ہوئے تلخ آنسوؤں
کو آپ کے حضور لائینگے۔ آپ شیریں مسکراہٹوں کی صورت میں ان کو دیکھینگے۔

میرا اندازِ تحریر عالمانہ مقالہ نگاری نہیں ہے۔ میں جس معاشرت کا ایک فرد
ہوں اُس کے جس گروہ یا شخصیت کو بھی قابلِ تحسین قابلِ خطاب یا لائقِ مذمّت گردانتا
ہوں جو کہنا چاہتا ہوں بیباکی سے ہنستا ہُوا کہہ دیتا ہوں۔ یہ مضامین جن کا نام نثرانے
قرار پایا ہے۔ مقالہ نویسی نہیں آپ سب سے بات چیت ہے میں آپ ہی میں سے
تو ایک ہوں میں نے آپکی زبان سے بارہا تحسین اور شاباش کے الفاظ بھی بہت سُنے

ہیں اب گالی سننے سے کیوں گھبراؤں۔
لال گوری کالی ڈفلیاں بجا بجا کر آپ کے معاشرے کو بے حیائی اور بازارِ حُسن کی طرف لے جانے والے اوباش مجھے کچھ بھی کہیں میں دشنام کا جواب مسکراہٹ سے دیتا رہا ملت کو گمرہی کی ترغیب دینے والے بازی گروں کی خفگیاں اور گالی گلوچ میری یافت میں یہ اضافہ ہے ان انعامات پر جو سر سیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ، محمد علی جوہرؔ ظفر علی خاں۔ جیسے میرے بزرگوں سے نصیب میں آئے
اس کتاب کے چند مضامین مدتِ گزری چند وقتاً فوقتاً ادبی رسائل اور بعض جرائد میں شائع ہوئے جن کو اب ملت نسیانی کوٹھری میں پھینک چکی ہے۔
بعض مضامین ایسے ہیں جو قلمبند تو ہوئے لیکن میں ان کو شائع کرانا خود بھول گیا بعض خطوط کے جواب ہیں بعض خود اپنی ذات سے دل لگی ہے جکا خود بخود مستحق ہوں بہرصورت ہر مضمون آپ کو خود بتا دے گا کہ وہ کیا ہے۔ کیوں ہے کب اور کیسے وارد ہوا تھا!
البتہ ایک بہت ہی اہم مقام اس کتاب کے آغاز میں آپ کے مطالعہ میں آئیگا جس کا عنوان ہے۔ ہم اہلِ قلم۔
یہ مضمون کچھ مدت ہوئی میں نے لکھ کر شائع کیا تھا۔ اُس وقت اس کا عنوان تھا بڑی کتابیں۔ یہ تحریر اُن چند بد معاش مصنفوں کے مُنہ پر طمانچہ تھا جو پاکستان میں بھارت سے آکر، پاکستان کا کھا کر مصنف بن بیٹھے ہیں اور پاکستان کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے۔ مسلمان مردوں کو ہندو اور سکھوں کے چنڈال غلام مسلمان عورتوں کو بے حیا لونڈیاں بنوا دینے کے لئے ایسی کتابیں لکھ لکھ کر پھیلا رہے ہیں کہ اگر ہمارے

ملک کا دستور ایسا ہو جو قرآنی کہلاتا ہے تو اسلامی پاکستان میں رہ کر ان ڈسنے والے
سانپوں کا سر کچلنا ہر کلمہ گو کا فرض ہے۔ میری عمر ۷۶ برس اور گیارہ ماہ ہو چکی ہے
دماغ کی رگیں شکستہ ہونے کے بعد عارضۂ قلب اور متعدد لاحق امراض کے علاوہ
موجودہ صورتِ حالات مجھے مارے ڈال رہی ہے معاشرے کی حالت مجھے بندوں سے بھگا
کر ہمیشہ کے لیے اللہ کے حضور فریادِ ملت بنا کرلے جا رہی ہے پاکستان کے ساتھ
قائداعظم کے بعد جو بیت چکی اور اگر آپ سب اسی طرح بے فکرے بنے رہے تو
آنے والا دور نقش بہ دیوار ہے

میری تمنا ہے کہ آپ اپنی آل اولاد کو محفوظ رکھنے کے لئے ہوش میں آجایئے
میری قبر پر فاتحہ کے لئے نہ آیئے گا۔ اپنے پاکستان کو سُرخ سیلاب سے بچایئے
گا

حفیظ

ہم۔ اہلِ قلم ——!!

جب تک یہ طلسمِ ہستی قائم ہے انسانی دنیا کی کوئی چیز ضائع نہیں ہو سکتی۔ ایک کتاب ایک فقرہ ایک لفظ کبھی فراموش یا گم نہیں ہوتا۔ جس طرح وہ لفظ جو دوسروں کے لئے باعثِ خیر ہے۔ ہر عالم کو راہِ راست پر چلاتا اور اندھیروں میں فرش پر عرش کا نور پھیلاتا ہے اسی طرح ہم میں جو اہلِ قلم شرارت یا غلطی کا ارتکاب فرماتے ہیں ہمیشہ ان کی بے ضمیری یقین کر لیتی ہے کہ لوگ بھول جاتے ہیں۔ لکھنے کے کچھ دیر بعد سمجھ لیتے ہیں کہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن شرارت یا غلطی کی پاداش ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جب ہم اخلاق کی زنجیروں کو توڑتے ہیں تو اس شکست کی آواز دنیا میں گونجتی ہے۔ باتیں، اعمال، خیالات کتنے ہی خفیف اور بے حقیقت کیوں نہ سمجھے جائیں ہرگز وہ عارضی نہیں دیرپا بلکہ ابدی ہیں۔ خراب لفظ کبھی معدوم نہیں ہوتا۔ بلکہ سوگنا قوت کے ساتھ صدائے بازگشت بن کر ہم کو اور ہماری نسل کو سزا دینے آجاتا ہے۔ یہ قیامت کے بعد بھی قائم رہے گا۔ چنانچہ مذہبی آیات و اقوال میرے دعوے کی دلیل ہیں۔ "آدمی جو کچھ کہے گا اس کا جواب وہ ہو گا۔ اپنی ہی باتوں سے بے گناہ ثابت اور مبرا، اپنی ہی باتوں سے مجرم اور سزاوار ٹھہرایا جائے گا۔"

جو بری مثالیں اور برے کام پیدا کئے جاتے ہیں، ہمیشگی کی زندگی ساتھ لاتے ہیں اور کبھی نہیں مرتے۔ مرنا تو کجا کہانی کے دیو کی طرح اُن کے ہر قطرۂ خون سے ہزاروں ویسے ہی خونخوار دیو انسانی اخلاق کو نگل جانے کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کے نقوش

ہم - اہل قلم

زندگی کے ساتھ ناپید نہیں ہو جاتے۔ جو کچھ کیا جاتا ہے جو کچھ کہا جاتا ہے قائم رہتا ہے اور کبھی برباد نہیں ہوتا۔ اچھی باتوں کی طرح بری باتیں بھی ورثے کے طور پر ایک سے دوسرے دوسرے سے تیسرے تک پہنچتی اور بڑھتی پھیلتی ہیں۔ کوئی فعل ایسا نہیں جو مزید نتائج کی ایک لمبی زنجیر کی پہلی کڑی نہ ہو۔

ہر ذرہ جو نیکی سے مزین اور بدی سے آلودہ کیا گیا ہو دنیا اس کو مستقل طور پر قائم رکھتی ہے۔ زمین و آسمان کی درمیانی فضا ایک وسیع صفحہ ہے جس پر انسان کی ہر بات نقش ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ بلند آواز سے کہی گئی ہو، سرگوشی کے انداز میں ہو یا ارادے اور خیال میں مرکوز رہے۔ خیالات، الفاظ اور اعمال کا اثر انسان اور اس کے ہم جنسوں کی تقدیر پر پڑتا ہے۔ ہر ایک زندگی جس طرح بھی گذاری جائے نتائج کا ایک لامتناہی سلسلہ بناتی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ان نسلوں تک پھیلتا رہتا ہے جو ہمارے بعد پے در پے ہماری قائم مقام بنتی ہیں۔

جب خیالات و الفاظ کی برائی کا یہ حال ہے تو جان لینا چاہیئے کہ بری تحریروں، بری کتابوں اور بدکاری انگیز لٹریچر کے بد اثرات کس قدر ہولناک نتائج پیدا کرتے ہوں گے۔ اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ بری تحریر، بری کتاب، برے کاموں اور بری تقریروں سے بہت ہی زیادہ بری ہوتی ہے کیونکہ وہ آئندہ نسلوں کے خیالات کو برائی کے سانچے میں ڈھالتے رہنے کا زبردست ذریعہ بن جاتی ہے۔

مصنف خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے مگر اس کی تصنیف زندہ رہتی ہے۔ بری کتاب کا مصنف نوعِ انسانی کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ وہ تو مر جاتا ہے لیکن اس کی کتاب برائی، بداخلاقی اور شرارت پھیلانے کے لئے زندہ رہتی ہے

بے شک ہمارے زمانے میں چھاپے کے فن کی ترقی پرشکوہ اور بہت مفید ہے۔

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہی چھاپے کا فن گندی تحریروں، زہریلے رسائل، شر افشاں کتابوں کی نشر و اشاعت و شہرت کا آلہ بنا ہوا ہے۔ اس سے لچر، پوچ اور بے ہودہ تصانیف کی خوفناک پیداوار میں فراوانی ہو رہی ہے جو بلند خیالی شرافت اور مذاقِ سلیم کی قاطع ہے۔

ایک مفکر نے کیا عمدہ بات سادگی سے کہہ دی ہے:

"کاش اہلِ قلم کو معلوم ہو جائے کہ ہر بھلائی کے لئے جو ظہور میں آتی ہے اور ہر بُرائی کے لئے جسے دل نشیں کیا گیا ہے مصنّف اور صرف مصنّف ہی ذمّہ دار ہیں۔ ذہنی کوڑھ سے بھری ہوئی کتابیں خوبصورت لباس پہن کر ہمارے مطالعے میں آتی اور ہمارے کتب خانوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ہمارے گھروں میں گھُس کر ہماری زندگی کو جذام آلودہ کر دیتی ہیں۔"

آج کل آرٹ آرٹ کا شور مچایا جاتا ہے۔ ہم اس آرٹ کو کیا کریں جو ہمارے بچّوں کو بداخلاقی سکھاتا ہو۔ ہم مجلدات کے اندر حسین بندشوں، عبارت کے مرغوب اور دلآویز فقروں اور کتاب کی نفیس گٹ اپ کو وغیرہ کرتے کے لئے آواز کیوں نہ اُٹھائیں جب وہ بدکاری کی بھوک اور تباہی کی پلیگ بنا کر پھیلائی جائیں۔

یہ قول نہایت شر انگیز ہے کہ "فن کو فن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے"۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر نفاست کو پیشِ نظر رکھا جائے تو برائی کا آدھا اثر دور ہو جاتا ہے۔ یہ خیال شر انگیز اور بہت ہی گمراہ کُن ہے۔ وہ برائی بہت ہی خطرناک ہے جو رنگین لفظوں اور حسین بندشوں میں مرصع ہو کر ہمارے دل میں کھُب جائے۔

مثال کے طور پر ہم اُن گھناؤنی کہانیوں، افسانوں اور ناولوں کو پیش کر سکتے ہیں جو نہایت نفیس عبارت آرائی کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں فروخت کئے جاتے ہیں اور

ہم — اہلِ قلم —

جن کو ہمارے نوجوان شوق سے مزے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ پھر آپ خود ان کے ہیرو بننے کی مشق کرتے ہیں۔ ان افسانوں اور ناولوں کی رسائی شریف گھرانوں کی معصوم عورتوں تک بھی کی جاتی ہے۔ ایسے افسانوں اور ناولوں کے آغاز میں ایک بیباک جوان اور ایک پردہ نشین کے درمیان قومی روایات اور قوانین کے خلاف بے باک منافسہ ہوتا ہے اسے معاشقہ کہہ کر لفظِ عشق کی توہین کی جاتی ہے۔ اور اختتام ایک خاندان کی بے عزتی ایک ناموس کی بربادی پر کیا جاتا ہے۔ اور اس معصوم کو فاحشہ بنا کر گندگی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آزادیٔ خیال کے نام پر ہو رہا ہے۔ اور حریتِ گفتاری پر ناز و غرور ہو رہا ہے۔

ہمارے اکثر افسانوں میں چوری، قتل و غارت، نفس پرستی، بدمعاشی، خود غرضی کی ترغیبیں ہیں۔ ہمارے نوجوان چمکدار تحریروں سے چندھیاتے ہیں۔ اندھے ہو کر پڑھتے ہیں۔ اور برباد ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان ننگے سینمائی گیتوں کا اثر دیکھئے جو ہماری مجلسی زندگی میں دخل انداز ہو رہے ہیں۔ اور جو نوجوانوں کی صحبتوں میں بطور نُقلِ محفل استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کو ٹی وی کی محاضرات اور ریڈیو کی نشریات کے ذریعے گھروں بازاروں اور گلیوں میں سنایا گایا جاتا ہے۔ اس سے ملک کی فضا تھرتھرا رہی ہے۔

حُسن کے اثرات اور عشق کے جذبات کو، ایسے افسانے، ایسے فیچر، ایسے ڈرامے ایسی تصاویر متحرک ہوں یا جامد بُرا ہم نہیں کہتے۔ ہم ان کو زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن حُسن انسان کے دل میں اعلیٰ و ارفع جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور عشق خودداری، شرافت اور فروتنی کو ابھارتا ہے۔

ٹھنڈے دل سے غور کرو اور جواب دو کہ ایسے گیت جو ملک کے بچے بچے کی زبان پر چڑھتے جاتے ہیں۔ آنکھوں سے دلوں میں سماتے ہیں کیا ان میں ہوس کاری کے جذبات

کا اظہار کُھلم کُھلا نہیں کیا جاتا۔ اور کیا ان کے مصنّف واقعی بداخلاقی کا زہر پھیلانے کے مرتکب نہیں ہیں۔؟

سچ ہے۔ اچھی کتاب دس ہزار برس گذشتہ میں بھی لکھی گئی ہو آج کامیاب زندگی کا مقصد مقرر کر سکتی ہے اور بُری کتاب معاذاللہ۔ اس کی آواز ساحرہ کے گانے کی طرح جادو بھری ہوتی ہے۔ یہ جوانوں کے جذبات کو ہیجان میں لاتی ہے انہیں مجرمیت پر اُکساتی ہے۔ ایسی کتاب کے مصنف اپنی قبروں میں سے اپنی سڑاندھ اُگلتے ہیں اور تمام دنیا اُن کی گندہ دہنی سے اور بھی زیادہ بدبُودار ہوتی چلی جاتی ہے۔

کتاب ایک زندہ آواز ہے جو رُوئے زمین پر چکّر لگاتی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا زندہ خیال بنی رہتی ہے جو ہمارے مُلک ہماری مِلّت اور ہمارے وقت سے خارج ہو چکا ہے انسانی خیال ہی ہے جو پائندہ ہے۔ خیال ہی ہے جو پیچھے باقی رہ جاتا ہے۔ جسے فنا نہیں سقراط اور افلاطون کیا ہوئے۔ غزالی اور سعدی، رُومی کے اجسام کہاں ہیں۔ ان کی مٹّی مٹّی میں مل گئی لیکن وہ خُود زندہ ہیں پائندہ ہیں۔ اپنی تمام نیکیوں اور شرافتوں کے ساتھ زندہ ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیالات ان کی تصانیف الوُرِ ربانی سے تابندہ ہیں۔

مگر وہ مصنّف وہ شاعر وہ ادیب اور وہ فلاسفر بھی زندہ ہیں جن کو محض اپنا کوئی ذاتی مفاد مدِنظر تھا یا کسی ترغیب کے زیرِاثر اپنے زورِ قلم کو شیطانی جنبشوں کے سپرد کر دیا تھا۔

اگر اچھی کتاب زندگی کا خزانہ ہے تو بُری کتاب ایک ڈائن ہے جو کلیجہ چاٹ جاتی ہے۔

اچھی کتاب (نثر ہو یا نظم) وہ ہے جو راست بازی، سچائی اور شرافت کی تعلیم دے۔ انصاف اور انسانیت کے اصول سمجھائے۔

ہم اُن کتابوں کو بُرا سمجھتے ہیں جو خودغرضی، بے اعتمادی، بداعتقادی اور سفلی جذبات

ابھارنے میں مدد دیتی ہیں اور جذبات کو ہیجان میں لا کر انسان کو جانور بننے پر اُکساتی ہیں۔

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جانا چاہیے۔ میں فی الحال کسی مُردہ مصنف کا نام اس لئے نہیں لیتا۔ اس کی تصنیف کا بھی ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ مبادا لاکھوں جوانوں میں سے ایک کے دل میں اس کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جائے جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگی اور کسی زندہ مصنف کا نام لینے سے اس لئے پرہیز ہے کہ وہ ضد کے مزے میں شرارت کو مزید حرارت نہ دکھائے۔ جو پرانی شرارت سے رزق نگلتا ہے اس کو اپنے منہ سے پھر اگلی کو کھیچ اور زیادہ گندگی نہ اچھالے۔

اس وقت اہل قلم کو اپنی کی ماں بہن بیٹی کا واسطہ دیتا ہوں۔ آئندہ نسل کا نام لے کر منت کرتا ہوں کہ ایسے ادب کو پڑھنے اور ایسی کتابیں لکھنے سے ہمارا دورِ حیات ختم ہوتا ہے۔ قطعی بربادی کا احتمال ہے۔ اس اندازِ تحریر کو ختم کیجئے ورنہ آنے والا زمانہ تم پر لعنت بھیجے گا۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک کہانی پڑھ لیجئے۔ جس کا خیال اخذ کردہ اور اسلوبِ تحریر میرا ہے۔

ڈاکو اور مصنف : رُوحوں کی مملکت میں عادلِ صادق کے سامنے فیصلے کے لئے دو گناہگار ایک ہی وقت میں پیش ہوئے۔

اُن میں سے ایک بہت بڑا سفاک ڈاکو تھا۔ اور شاہراہ پر تلوار کے زور سے مال جان کو غارت کیا کرتا۔ شہروں، بستیوں، گھروں، بازاروں میں قتل و غارت اس کا پیشہ تھا۔ جسے انسانی دنیا میں آخرِ کار پھانسی کی سزا ملی۔

دوسرا ایک مصنف تھا۔ بڑا مشہور، بڑا نامور۔ وہ اپنی تصانیف میں زہرِ ہلاہل حل کر

دیا کرتا تھا۔ اُس نے حسین الفاظ اور رنگین عبارتوں کے ذریعے بداخلاقی کا پرچار کیا تھا۔ انسانی دُنیا میں مرنے کے بعد بھی اس کی شہرت بدستور قائم تھی ——— عادلہ مطلق کی عدالت کارروائی شروع ہُوئی۔ رُوحوں کے ملک میں یہ کارروائی بہت ہی مختصر ہوتی ہے۔ وہاں بے فائدہ وقت ضائع نہیں کیا جاتا۔ فیصلہ فوراً سُنا دیا جاتا ہے

لوہے کی دو بڑی دیگیں موٹی زنجیروں میں باندھ کر معلّق لٹکائی گئیں۔ ایک دیگ میں ڈاکو بٹھا دیا گیا۔ دوسری میں مصنّف کو ڈالا گیا۔ دونوں کے نیچے ایندھن کے بڑے بڑے انبار جمع کیے گئے۔ حکم دیا گیا کہ آگ دکھا دی جائے۔ !

ایک تادیبی رُوح اٹھی اور اُس نے دائیں ہاتھ سے ڈاکو والی دیگ کے نیچے انبار کو آگ دکھائی اور بائیں سے مصنّف کی دیگ کے نیچے۔

ڈاکو دیگ تلے آگ اتنے زور سے بھڑک اٹھی کہ ایوانِ جہنّم کی چھت کے پتّھر بھی چٹخنے لگے اور چشم زدن میں یہ سزا ختم ہوگئی۔

مصنّف کی سزا کچھ زیادہ سخت کیا بہت ہلکی نہ ہونے کے برابر دکھائی دی۔ کیونکہ اس کی دیگ کے نیچے پہلے پہل آگ کی لَو بھی مشکل سے پھُوٹتی تھی۔

لیکن یہ سلگتی سلگتی بڑھتی گئی۔ سلگتی گئی بڑھتی گئی۔ بڑھتی اور بڑھتی اور بھی بڑھتی چلی گئی۔ صدیاں گذر گئیں اور رُوحوں کی دُنیا میں صدیاں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ مصنّف کی دیگ تلے آگ بڑھتی چلی جاتی تھی۔ حالانکہ ڈاکو والی دیگ تلے کی راکھ بھی سرد ہو چکی تھی۔

مصنّف کی دیگ تلے جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا شعلے تیز اور تیز، تند اور تند ہوتے چلے جا رہے تھے۔

جب مصنّف نے اپنے عذابوں میں کمی ہوتے نہ دیکھی تو آخرکار چلّا اُٹھا:

۴۔ اہلِ قلم

" باری تعالےٰ یہ کیا انصاف ہے ؟ میں نے اپنی طبّاعی سے کام لے کر دنیا کو اپنی شہرت سے بسا دیا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میں نے ذرا آزاد نگاری سے کام لیا تھا۔ اگر یہ بھی تیری نظر میں گناہ تھا تو اس گناہ کی سزا مجھے مل چکنی چاہیئے۔ اے خدا بتا کیا میں نے اس ظالم اور ہلاکو ڈاکو سے بھی زیادہ گناہ کیا تھا۔ "

مصنّف کی فریاد گونجتے ہی ایک فرشتۂ عذاب ہاتھ میں خونریز تازیانہ لئے نمودار ہوا۔ جس کے ہر ہر مُو سے پھنپھناتے سانپ زبانیں نکال رہے تھے۔ فرشتۂ عذاب بولا بدنصیب! کیا تو خدا کو الزام دیتا ہے ؟ کیا تو اپنا مقابلہ اُس ڈاکو سے کرتا ہے جس کا جُرم تیرے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا، اُس نے تو صرف اتنی مدّت تک ظلم اور بے رحمی کی تھی جتنی مدّت وہ زندہ رہا۔ لیکن زمانے بیت گئے۔ قرن ہا قرن گذر گئے اگرچہ زمین پر تیری ہڈیاں گل کر خاکستر بن چکی ہیں۔ پھر بھی ہر نئی صُبح وہ بُرائیاں پھیلاتی ہوئی طُلوع ہوتی ہے۔ جن کی تخلیق تیرے سبب سے ہوئی۔ تیرا پھیلایا ہُوا زہر جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے مُہلک سے مُہلک تر بنتا ہے بد سے بدترین ہوتا جاتا ہے یقین نہیں تو دیکھ ——— !

چشم زدن میں مصنّف کے سامنے دُنیا آئینہ ہوگئی۔ فرشتہ بولا:۔ دیکھ ان بچّوں کو جو اپنے خاندان کے لئے شرم کا باعث ہیں۔ دیکھ اِن بوڑھوں کو جو گمراہ رہے ہیں دیکھ اُن ماؤں کو جو مایوس ہیں۔ ان کے دل و دماغ کس نے خراب کئے ؟ تُو نے ——— ! کس نے نکاح کے قوانین کا مضحکہ اُڑایا۔ کس نے دین و ایمان کو فضول بتایا کس نے پاکیزگی کے خیالات کو بیوقوفی لکھا۔ کس نے سماجی پابندیوں کو توڑنے کی تعلیم دی ؟ تُو نے۔!

کیا تو نے بدی کو رنگا رنگ لباس ہائے فاخرہ پہنا کر حسین و دلربا صورتوں میں پیش نہیں کیا ؟ کیا تُو نے ہوس کاری کو محبت نہیں بتایا ؟ کیا تو نے بے حیائی کی نظر فریب تصویریں

نہیں کھینچیں ——— ؟

اب دیکھ انسانی دنیا تیری شرارتی ترغیبی تحریروں سے گمراہ اور ذہنی کوڑھ میں مُبتلا ہے دوسروں کو تباہ و برباد کرتی جارہی ہے اس غارت فساد اور بغاوت سے بھر گئی ہے۔

اصل یہ تو ہے جس نے ان کو تباہی کے گڑھے کی طرف جانے کی ترغیب دی تھی۔ ان کے آنسو اور خون کے ہر قطرے کے لئے تُو اور فقط تو ذمہ وار ہے۔ لیکن ابھی اس تباہی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جو تیری تصانیف سے آگے ہی آگے پھیلتی جاتی ہے ———!

کیا اب بھی تُو خدائے عادل کو الزام دینے کی جرأت کرے گا۔ یہ سزا کی جگہ ہے اور یہاں سزا گناہ کے مطابق ملتی ہے۔" ———!"

یہ کہا اور غضبناک فرشتۂ عذاب نے دیگ کا ڈھکنا زور سے بند کر دیا ———!

غبارِ تمنّا

کون کیا ہے۔ کتنا ہے۔ وضع قطع گفتار اور رفتار کی مماثلت سے یہ جان لینا محال ہے۔ انسانی پسند ناپسند اولتی بدلتی کیفیتیں ہیں۔ سائنس یا فلسفہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے فیصلہ قرآنِ حکیم ہی بتا رہا ہے کہ دنیا میں دین کی ہم آہنگی انسان کی اُخوّت ہے میں اپنا محاسب رہا ہوں۔ تعلقات کی بُت و شکست اور انسانی دوستوں میں خلوص سے مایوس آسمان کو تکتا ہوا تنہا روی سے اپنی منزل کے رُخ اپنا ہی شعر"

فرش سے مطمئن نہیں پست ہے ناپسند ہے۔ عرش بہت بلند ہے ذوقِ نظر کو کیا کروں

الاپنے کا عالم تھا۔ کہ اچانک ایک غبار نے مجھے آگھیرا ——— !

یہ غبار خیرہ کن نہ تھا کہ جھٹک دیتا یہ تو بصیرت کو توانائی دے رہا ہے۔

قدم بقدم اس کی لہریں مجھے غزلوں کے ایسے شعر سناتی ہوئی۔ ایسی لذیز محسوس ہوتی ہیں جو میری طے کردہ راہوں میں مجھ پر بیتی ہوئی کے چمکتے آئینے ہیں۔ "اے غبار تو کیا ہے۔!" "میں ہوں غبارِ تمنّا" ——— !

کسی کی تمنّا؟ محمد منوّر نے خدا شناش نظر کی تلاش و آوارگی کے دور میں مجھے ہویدا کیا ہے۔! "یہ محمد منوّر کون ہے"؟

"مجھے اپنے ساتھ چلتا رہنے دے میں تیری منزل تک یہ سب کچھ بتاتا سمجھاتا چلوں گا کہ محمد منوّر کون ہے کتنا ہے۔ اور یہ بھی تمام دکھاؤں گا کہ اتنا کیوں ہے"۔! "بہت خوب رفیقِ سفر تو بہت ہی خوب ہے"

اے غبارِ تمنّا ——— !

اُردو کی مُخالفت

مخزن جولائی ۱۹۲۷ء

۱۸۸۳ء میں۔ انڈین ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس کے مقاصد میں ہندوستان کا دَورہ کرنے کے بعد یہ بتانا تھا۔ کہ اس وقت تک تعلیم کی اشاعت کسقدر ہو چکی ہے اور آئندہ اشاعت کے لیے کیا انتظامات لازمی ہیں ؟ تاکہ گذشتہ ایام میں جو نقائص تھے ان کو رفع کرنے کی تدبیر کی جائے۔ اس کمشن کے صدر "ڈاکٹر ہنٹر" تھے۔

یہ کمیشن پنجاب بھی تشریف لایا تھا۔ اور پنجاب ؟ دہلی۔ گڑگاؤں تک پنجاب ہی پنجاب تھا۔ اس کمیشن نے اُن دِنوں بالکل ایک انوکھی اور نئی بات جو اُردو کے خلاف تخلیق (CREATE) کی۔ وُہ یہ تھی کہ صوبۂ پنجاب میں تعلیم چونکہ صُوبے کی مادری زبان میں نہیں ہوتی ایک غیر زبان میں ہوتی ہے۔ جس کا نام اُردو بیان کیا جاتا ہے ــــ محض اسی وجہ سے اشاعتِ تعلیم میں کمی واقع ہو گئی ہے ــــ کمیشن کی یہ رائے ہنگامہ آرائی کا سبب بن گئی۔

اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر صاحب نے میرے استفسار پہ بتایا۔ کہ مُسلمانوں نے جن کے ساتھ بہت سے ہندو بھی شامل تھے۔ یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ اُردو پنجاب میں کوئی غیر زبان نہیں ہے۔ پنجاب کی کثیر آبادی مثلاً انبالہ۔ رہتک۔ دہلی۔ پانی پت۔ کرنال۔ حصار۔ گڑگانوہ وغیرہ کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مادری زبان اُردو ہی ہے۔ دُوسرے اضلاع اور ریاستیں مثلاً لدھیانہ، نابھہ، فیروزپور، پٹیالہ میں

لوگ اُردو ہی ذرا لہجے کی تبدیلی کے ساتھ بولتے ہیں مگر سمجھتے اور لکھتے سب اُردو ہی ہیں۔

مَیں نے مزید پتہ چلایا تو صاف ثابت ہوا کہ عدالتوں میں جہاں اَن پڑھ لوگ مقدمات کی پیروی اور شہادت کے لئے آتے ہیں اُن کے لئے عدالت کی زبان اُردو ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی دقّت پیدا نہیں ہوئی ——— اور وہ زبان جسے پنجابی کہا جاتا ہے۔ ایسی بٹی ہوئی مقامی بولیوں پر مشتمل ہے جو محض اپنے مقام پر بولی جاتی ہیں۔ دُوسرے مقامات میں قطعاً اختلاف رکھتی ہیں۔ الفاظ میں اختلاف۔ تلفّظ میں اختلاف۔ مطالب میں اختلاف۔ لہجے میں انتہائی اختلاف۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ایک ضلع بلکہ تحصیل کی بولی الگ الگ ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے رسم الخط کے حرف حرف آپس میں جُڑنے سے اُسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح ہندو اور سکھ قوم کے افراد آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی بھی نہیں سکتے۔

سکھوں نے کہا، پنجابی ہندی سے ایک الگ زبان ہے اس لئے ہم پنجاب میں اس کو رائج کر دکھائیں گے ورنہ کرپان چلائیں گے۔ اور اُردو سے بھی اس کا گٹھ جوڑ نہیں۔ پنجابی گورمکھی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ یہ ہمارے سنت سری گورؤوں کی بولی ہے۔ یہ بھی سفید نہیں کالا جھوٹ تھا۔ گوروارجن سنگھ یعنی سکھوں کے آخری گرو کی بولی بھی فارسی ملی اُردو تھی۔

چند آدمی یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ یہ زبان کا کوئی تنازعہ ہی نہیں ——— رسم الخط یعنی حرف حروف کا جھگڑا ہے۔ لہٰذا اسے اُن انگریزی حروف میں لکھا جانا چاہیے جن کو رومن حروف کہتے ہیں۔ یہ مسٹر گاندھی کی چال تھی۔

اس طرح سارے پنجاب میں اس سوال پر اتنا جوش و خروش پیدا ہوا کہ سکولوں،

کالجوں کے بورڈنگ ہاؤسوں میں طلباء کے درمیان اس سوال پر کشمکش عملی صُورت اختیار کر گئی۔ اوران تین گروہوں نے آپس میں لڑنا، جھگڑنا۔ مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔

اسی دوران سر چارلس ایچیسن جو اس وقت صوبہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ امرتسر پہنچے سکھوں نے ان کو ایک بہت مؤدبانہ ایڈریس دیا جس میں اُردو کو ترک کرنے کے بعد ہندی بھاشا بحروف ناگری کے استعمال کی تجویز کو ایک نئی مصیبت بیان کر کے پنجابی کو بحروف گورمکھی جلد از جلد رائج کرنے کا مطالبہ کیا اور گورنر کو یاد دلایا کہ سرکارِ انگریزی کے سب سے زیادہ وفادار سکھ ہی ہیں اس لئے ان کا مطالبہ لازماً منظور ہونا چاہئے ۔۔۔!

یہ لفٹننٹ گورنر اس معاملے پر پُورا پُورا غور کر چکے تھے۔ اس ایڈریس کے جواب میں جو کچھ اُن کی زبان سے نکلا وُہ اس طرح درج گزٹ ہُوا۔

" دانا اور تجربہ کار انگریز عہدہ داروں اور عام تربیت یافتہ ہندو مُسلم اور سکھ شُرفاء کی آراء یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ صوبہ پنجاب اور شمالی ہند میں اُردو زبان قائم رہنی چاہئے۔ ان میں سے کسی کی رائے طرفدارانہ یا متعصبانہ رائے خیال کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہی وجوہ جس کے مدِّنظر میں ہندوستانی (اُردو) زبان فارسی حروف میں لکھنے پڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں "

انگریز لفٹننٹ گورنر جانتا تھا کہ اگر پنجاب میں مسلمانوں پر زبان کا حربہ کلی کر دیا۔ تو فوج جس میں پنجابی مسلمان ہی سب سے زیادہ ہیں ان پر بہت بُرا اثر برطانیہ کے خلاف پڑ سکتا ہے۔ اس لئے اُس نے بڑی مصلحت سے یہ فیصلہ سُنا دیا۔ اور اُس کے اِس فیصلے نے پنجابی، گورمکھی اور دیوناگری وغیرہ کے حامیوں اور اُردو کے دشمنوں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اُردو کی مخالفت

اب اُس کمیشن نے بھی (جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے) رُخ بدلا۔ اور واقعات کو مختصر طور پر بیان کرتے ہُوئے یہ طے کیا اور فیصلہ دے دیا۔ کہ اب پنجابی وغیرہ کو پیش کرنے کا معاملہ چونکہ "علمی نہیں" "سیاسی" بنا دیا گیا ہے لہذا کمیشن اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔

اُردو کی یہ مخالفت میری ولادت سے بہت پہلے آغاز ہو چکی تھی۔ متذکرہ بالا بیان میری تحقیق اور میری تلاش کا حاصل ہے۔ — البتہ مَیں نے خود اپنے لڑکپن میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک یہ سُننا شروع کیا اور ساتھ ہی کم کم سوچنا بھی۔ کہ سِکھ سبھا نے دوبارہ یہ سوال اُٹھایا۔ سِکھ اُردو کو پنجاب سے اُکھاڑ پھینکنے میں اپنی ایڑی سے لے کر چوٹی کے کیسوں کا زور بھی لگا رہے تھے۔ مگر ۱۹۰۹ء میں سر ایچیسن کی طرح پنجاب کے لیفٹنٹ گورنر سر لُوئی ڈین نے بھی سارے ہندوستان میں زبان کے شور و شر سے گھبراتے ہُوئے سِکھوں اور ہندوؤں کے منصُوبے یہ کہتے ہُوئے رَد کر دئے۔ کہ

"ہمیں اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا اعلیٰ ذریعہ ماننے پر مجبور ہو کر بدستور قائم رہنا چاہیئے۔"

اِس انگریز نے سِکھوں کو حصولِ اُردو کی طرف اِن الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔

"اُردو آپ کو لازماً سیکھنی چاہیئے — اس لئے کہ یہ عدالتوں اور سرکاری دفتروں اور مہذب، انسانوں کی مستند زبان ہے۔ اب ہماری تمام سرکاری مثلیں اسی زبان میں لکھی جاتی ہیں۔ پس آپ کو اس معاملے میں اپنے قومی پیشوا سری گوبند سنگھ جی کی مثال پر کاربند ہونا چاہیئے جنہوں نے فارسی کو اس وقت کی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے بہت ذوق شوق سے سیکھا۔ اور اس میں اعلیٰ درجے کی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ ایسی دستگاہ کہ ان کے فارسی اُردو اشعار اب تک زبان زدِ خاص و عام ہیں۔"

یہاں تک سادی اور سیدھی اُردو میں جو کچھ مَیں نے بیان کر دیا ہے مخزن کا مطالعہ فرمانے والوں پر ثابت ہے۔ کہ اُردو کے مقابل ہندی اور پنجابی کو "پائے چوبیں" کے سہارے کھڑا کرنے اور واہ گورو جی کا خالصہ واہ گورو جی کی فتح۔ اور جے ہند کے نعرے لگانے کا فتنہ دب گیا تھا۔

لیکن افسوس بعض لوگوں نے ان انتہائی مفید نصائح کی قدر نہ کی۔ اور اندر ہی اندر آگ سُلگاتے رہے۔

مَیں اپنے آغازِ شعر گفتن میں اُردو اور پنجابی دونوں کا رسیا شاعر تھا۔ لیکن خود میرے مذاقِ سخن اور غور و فکر نے مجھے اُردو ہی کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کی تلقین کی۔ اُردو کے خلاف ہر لمحہ شعلے بھڑکے۔ چنانچہ بعض اُمیدوں اور "منہوں" کی بنا پر امرتسر ڈسٹرکٹ بورڈ۔ اور لائل پور ڈسٹرکٹ بورڈ نے یہ قراردادیں منظور کرا ڈالیں کہ :-

"پرائمری مدارس میں تعلیم کا ذریعہ اُردو کی جگہ پنجابی کو قرار دیا جائے"

دشمنانِ اُردو نے اس مطالبے کو پنجاب کا مُتفقہ مطالبہ ظاہر کرنے کے لئے شملہ کی چوٹی پر ، حال ہی میں ، ایک بہت بڑا پنجابی دربار بھی منعقد کر ڈالا۔ اس میں پنجابی کے شاعر پچاس ساٹھ کی تعداد میں دُور دُور سے بُلائے گئے۔ جن میں ہندو اور سکھ تو تھے ہی مگر مُسلمان بھی تھے۔ وُہ مسلمان جن کو پنجابی زبان پر عبور تو کیا ہوتا اس بات کا بھی شعور نہ تھا۔ کہ جہاں سے وُہ آئے ہیں۔ وہاں کے علاوہ ان کی بات پنجابی میں سمجھنے والا قریبی ضلع میں بھی کوئی نہیں یہ لوگ یہ مسلمان شاعر جیسی کچھ پنجابی ان کو آتی تھی اس میں اپنی رسی حرفی ، شاعری فرماتے۔ اور ہندوؤں اور سکھوں سے داد کے ساتھ روپیہ کی امداد بھی حاصل کرتے۔

شملے میں اس شاندار پنجابی دربار کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں پر ثابت کر دیا جائے۔ کہ اب پنجابی زبان اُردو کی جگہ چھین لینے کے قابل ہو گئی ہے۔ لیکن اس بہت بڑے پنجابی کُوی دربار میں بھی اللہ نے جس بندے کے ذریعے ان کو شکست دی۔ وُہ بندہ آپ کے سامنے اس وقت صورتِ حال بیان کر رہا ہے۔ اور پکارتا ہے۔ کہ اگر کوئی اس بیان کے کسی حصّے کو بھی غلط ثابت کرنا چاہے تو مخزن ہی میں اس کا بیان چھاپ دیا جائے گا ـــــ اور اس پر گواہیاں سکھوں اور ہندوؤں کی طلب کی جائیں گی۔

یہ واقعہ تفصیل طلب ہے۔ مَیں اختصار سے کام لیتا ہوں۔ شیخ نیاز علی ریٹائرڈ انسپکٹر تعلیمات پنجاب میرے دفتر (مخزن) میں تشریف لائے۔ فرمایا کہ جس طرح بھی ہو مجھ ہی کو شملہ پہنچ کر اس فتنے کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ شعر و شاعری میں میرے ہی سادہ گیت ہندو مسلمان سکھوں کی زبانوں پر ہیں۔ اور سب اسی کو اپنی بولی سمجھتے ہیں۔

یہ فرما کر تشریف لے گئے۔ مَیں دارالاشاعت پنجاب گیا۔ بچّوں کے لئے میری تصانیف پھول مالا، ہندوستان ہمارا، بہار کے پھول، عمر عیار دو حصّے اور بہت سی کہانیاں کتابی صورت میں دارالاشاعت والے مجھ سے اجازت لئے بغیر لاکھوں کی تعداد میں فروخت کر رہے تھے۔ مَیں نے ان سے اُردو اور پنجابی کے اس تصادم کا حال اور شملہ جانے کی تجویز بیان کی۔ اور رائس رائلٹی سے روپیہ طلب کیا جو میرے حساب کی رُو سے ان کے ذمہ لیت و لعل کی تجوری کھینچا ہوا تھا۔ اس وقت فقط پانچ سو اُن ہزاروں میں سے اُردو کے لئے طلب کئے تھے۔ میری التجائیں کہ دارالاشاعت کے مہتمم

حمید علی صاحب نے اپنی زبان کی بھی مسکراتی لنگڑاہٹ کے ساتھ فرمایا۔ رائلٹی کا حساب تو کئی ہفتے چاہتا ہے۔ اور علی الحساب دینا اس ادارے میں ممکن ہی نہیں۔ امتیاز علی تاج کو اُن کی اُردو نویسی کا واسطہ دیا۔ وہ اپنے سوتیلے بڑے بھائی کی تائید نہ فرماتے۔ تو اپنے گھر میں جھگڑا پیدا کرتے۔ مایوس ہو کر اچھرے پہنچا۔ بیوی کی کچھ زریں چوڑیاں بڑی ردوکد سے حاصل کیں۔ شہر پلٹا۔ چوڑیاں ساڑھے تین سو روپے میں گرو رکھیں۔ اب لاہور سٹیشن سے گاڑی۔ کالکا اور کالکا سے ٹیکسی میں لدا ہوا شملے کے مسلم ہوٹل میں ڈیرہ اجا لگایا۔

شملہ میں مجھ کو جاننے پہچاننے والے ہندوستان بھر سے آنے والے خاص و عام اُردُ شاعر تھے۔ جتنے بھی راہ باٹ پر ملے سب نے پوچھا کیوں حضرت پنجابی دربار میں بھی بلائے گئے ہو؟ ——— میں نے ان سب کو جواب دیا ہاں۔ آپ بھی آئیں گے۔ سب نے جواب دیا اب تو ضرور آئیں گے۔ آپ کی زبان سے پنجابی شعر کبھی نہیں سنا تھا۔ آج یہ بھی سہی۔!

مزا یہ کہ میں نہ تو بلایا گیا تھا۔ اور نہ ٹکٹ خرید کر ہجوم میں سر چھپائے بیٹھنا چاہتا تھا۔ ڈیوی کو ہال میں اس سے پہلے اُردو کے بڑے بڑے مشاعرے ہو چکے تھے۔

میں ڈے وی کو (DE VI CO) سے باہر میدان میں جا کھڑا ہوا۔ سینکڑوں شملوی مسلمان اور بہت سے اُردو کے رسیا ہندو میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ اندر جانے کی راہ بند تھی بکرم سنگھ شہید باہر آیا۔ مجھے اور میرے اردگرد جمع ہونے والوں کو دیکھا۔ مجھ سے

کہا ہال تو پُر ہو چکا ہے فقط آپ کو سٹیج پر جگہ حاضر کی جا سکتی ہے۔ مَیں نے کہا اور یہ لوگ فرمایا۔ ٹکٹ ہی ختم ہو چکے ہیں۔

مَیں نے کہا اچھا دروازہ کھولیئے۔ دروازہ کھلا۔ مَیں نے داخل ہو کر اپنے گرد کھڑے ہوئے انبوہ کو اشارا کیا۔ یہ سینکڑوں گروہ گھس پڑے۔ ان میں ہندو مسلمان پنجابی بھی تھے دہلوی اور دُوسرے اضلاع کے وُہ بہت سے لوگ تھے۔ جو گرمیوں میں اپنی ملازمت یا کسی ضروری کام یا چند دن ٹھنڈک میں آرام کرنے شملہ میں موجود رہا کرتے تھے۔

ہال میں جگہ واقعی کم تھی۔ لیکن یہ انبوہ اِدھر اُدھر دیواروں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ شہید نے مجھے لے جا کر جب سٹیج پر صدر کے دَہنے بٹھا دیا۔ تو خود مجھے حیرت ہو گئی کہ مجھے دیکھتے ہی سامنے کے مجمعے نے تالیوں "لو بھئی حفیظ بھی آ گیا" کے شور کو شملہ کی چوٹی سے بھی بہت بلند کر دیا۔

ہندو صدر لاہور کے بیرسٹر دیوان مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں اور میرے اُردو گیتوں کے اس لئے قدر دان ہیں ان کو ان میں ہندی کے وہ الفاظ جو اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ مزا دیتے تھے۔

میرا خیال یہ تھا۔ کہ میرا بھی اس طرح بن بلائے گھس آنا اور اپنے ساتھ اپنے شیدائیوں کا سیلاب لے آنا۔ بہت کھٹکے گا ——— باہمی کُھس پُھس ہوئی۔ خیر گذری۔ کھٹکا کانوں ہی تک محدود رہا۔

پنجابی کے شاعر بلائے جاتے اور آتے اپنی بولی مَیں سُناتے رہے چند سامعین جو ان کی بولی سمجھتے تھے۔ ایک آدھ واہ کہدیتے۔ ورنہ لوگ اس طرح خاموش تھے جیسے موسم گرما میں یہاں پر برف گرنے سے سب سُن ہو کر رہ گئے ہوں۔

اچانک دیواروں سے لگے کھڑے ہجوم کی طرف سے شور اُٹھا۔ حفیظ حفیظ اور ساتھ ہی آوازیں اُٹھیں ابھی تو میں جوان ہُوں۔ رقاصہ۔ برسات، پریت گیت۔

پنجابی دربار کے صدر اور سیکریٹری نے بڑی بینتی سے پنجابی میں چند لفظ میری مدح میں فرما کر فرمایا۔ کہ مَیں پنجابی ہی میں کچھ سُناؤں گا۔ مَیں اُٹھا۔ جو لوگ ابھی تو میں جوان ہوں اور رقاصہ وغیرہ سُنانے کے لئے پکار رہے تھے۔ اُن سے بھی اور "سبھا" سے بھی مخاطب ہو کر مَیں نے پنجابی ہی میں کہا۔ کہ مَیں تو بِن بُلائے آیا ہوں۔ ان پنجابی شاعر بھائیوں کی شاعری سننے اور مختلف ضلعوں کی بولیاں سننے کا شوق شملے لے آیا ہے۔ یہ ابھی تو میں جوان ہوں بعد میں ہوگا مَیں سب سے پہلے ایسے گیت سُناتا ہوں جس کو ہر پنجابی اور ہندوستان کا ہر شخص بلکہ گاندھی جی اور مالویہ جی بھی سمجھتے ہیں۔ مَیں اپنے پنجابی شاعر بھائیوں کا دِل سے احترام کرتا ہوں لیکن یہ فیصلہ اب اسی پنجابی دربار کا ہے۔ کہ میری شاعر برادری کے ان پنجابی شاعروں کو آپ پوری طرح سمجھتے ہیں۔ یا میرے گیتوں کی بولی کو جسے مَیں اُردو اور گاندھی مہاتما ہندوستانی کہتے ہیں۔ اس پر زور زور سے تالیاں بجیں —— مَیں نے پکار کر کہا مَیں آپ کو دھرم دیہ ایمان اور بال بچوں کی قسم دیتا ہوں کہ اگر کوئی ایک ہندو سکھ مسلمان اس سبھا میں کہہ دے کہ میرے گیت کو نہیں سمجھ سکا۔ تو مَیں آپ کو سلام بلکہ پرنام کر کے رخصت ہو جاؤں گا۔ پھر تالیاں بجیں۔ مَیں نے پریت کا گیت اپنی لَے میں سُنانا شروع کیا (آپ اسے نغمہ زار میں دیکھ سکتے ہیں)

اب آپ میری اپنی خود سرائی یا تعلّی کہیے۔ مَیں واقعہ بیان کر دینا ضروری جانتا ہوں کہ اُردو دُوسری مقامی بولیوں کے نرغے پر کس طرح حاوی کی گئی —— اور اس وقت فساد کے خطروں کو کس طرح ٹالا گیا۔ حقیقت میں شملے آنا اور وہاں اُردو کو پنجابی والوں پر

غلبہ دلانا میرا کارنامہ نہیں۔ اس کی تحسین اور داد دی جاسکتی ہے۔ تو شیخ نیاز علی اس کے مستحق ہیں۔

اب موضوع پر آئیے۔ پریت کے گیت کے ہر بند پر میں پُوچھتا تھا۔ دھرم سے کہو بات سمجھ میں آئی ہے یا نہیں سب کے نعرے یہ تھے کہ ہم سب سمجھ رہے ہیں۔ مَیں سُنا کر بیٹھ گیا تو ایک اور ایک اور ساتھ ہی ابھی تو مَیں جوان ہوں کا شور مچا۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ مشاعرہ پنجابی ہو یا ہندی۔ اگر مَیں کسی نہ کسی وجہ سے موجود ہوں۔ تو یہ شور نہ مچے ——————

صدر صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔ بھئی بہت سے شاعر بہت سا خرچ لے کر دُور دُور سے پنجابی شعر سنانے آئے ہیں۔ ان کو بھی سُن لو۔ اور مَیں حفیظ صاحب کو بہت سے گیت سنائے بغیر یہاں سے جانے نہیں دُوں گا۔

اس وعدے پر پنجابی بھائیوں کی شاعری ہوتی رہی۔ اور برف پر برف گرتی گئی۔ آخر لوگ حتّٰی کہ سکھ اور ہندو بھی تنگ آکر چلّا اُٹھے۔ کہ دیوان صاحب حفیظ کو سُنوا دیجئے (صدر جو لاہور ہی کے بہت بڑے بیرسٹر اور مانے ہوئے انگریزی کے مقرر بھی ہیں۔ خفا تو ہوئے لیکن دوبارہ مجھے بُلائے بغیر نہ رہ سکے۔

مَیں نے اُن کو ادب سے مخاطب کیا۔ اور کہا۔ کہ یہ زبان کا جھگڑا سامنے بیٹھے ہوئے عوام و خواص کا نہیں ہے۔ یہ تو سیاسی سر پھٹول کے لئے چند لیڈر کلاس کے لوگ پیدا کر رہے ہیں۔ پنجابی اور اُردو دو زبانیں نہیں ہیں۔ مَیں آپ کو دس گیت سنانے کو تیار ہوں۔ ایک گیت کا ایک مصرعہ یا تک اگر آپ سب کی سمجھ میں نہ آئے تو دھرم کا نام لے کر مجھے ٹوک دیجئے۔

اب میں نے جھوٹا سب سنسار۔ درشن درشن میرا۔ لو پھر بسنت آئی۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ باری باری سُنا ڈالے۔ لوگوں سے ساتھ ہی میں کہتا رہا یہ بولی ہے جس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ کیا آپ یہ بولی چاہتے ہیں یا وُہ جو پنجابی لیکھکوں نے آپ کو سُنائی ہے۔ لوگ تو بھرے بیٹھے تھے پنجابی لفظوں پر کھِلی اُڑانے لگے۔

حاضرین چِلّا اُٹھتے رہے یہی بولی ہماری زبان ہے۔ جب میں تھک گیا تو میں نے صدر کو سکھوں ہندوؤں کو پرنام کیا اور مسلمانوں کو سلام کرتے ہی اُٹھا۔ سٹیج سے اُترا۔ بمشکل بھیڑ میں سے نکلا۔ اور ہال سے باہر۔ لیکن میرے نکلتے ہی ہال میں جمع ہونے والے سب مسلمان ہندو سکھ ہجوم در ہجوم نکل آئے۔ اور مجھے گھیر لیا۔ گھیر ہی نہیں لیا۔ میرے گلے میں سینکڑوں ہار ڈال دیئے۔ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ اور زندگی میں پہلی بار میرا جلوس شملے کے ڈیوی کوکے میدان سے عوامی بازار میں اُترا اور مجھے میرے قیام گاہ مسلم ہوٹل تک پہنچا گیا۔

اخبارات میں ہندوؤں اور سکھوں نے محض چند الفاظ میں میری مذمت بن بلائے ہجوم کو ساتھ لے کر آ گھسنے کی چھاپ دی۔ لیکن دہلی کے روزنامہ ہمدرد نے پُورا کالم لکھا۔ اور مجھے مبارکباد پیش کی۔

بہرحال یہ روداد میں اپنے مخزن میں لکھ رہا ہوں۔ اس لیئے کہ یہ لوگ جو مختلف طریق سے پنجابی اور ہندی کا فتنہ پنجاب میں اُٹھا رہے ہیں۔ باز تو رہیں گے نہیں لیکن وُہ لوگ جو اُردو کے حامی ہیں۔ اُردو پڑھتے ہیں۔ اُردو لکھتے ہیں اُردو سمجھتے ہیں ان کو عقل کرنی چاہیئے۔ ہم لوگ اُردو کے اہلِ قلم۔ جو لکھنوی۔ دہلوی۔ سہارنپوری۔ الہ آبادی کانپوری زبان دانی کی دعوے داری سے ایک دُوسرے کی پگڑی اُچھال رہے ہیں۔ ان کا

ناطقہ بند کر دینا لازم ہے۔

مخالفین اُردو کو سمجھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ حامیانِ اُردو کا فرض یہ ہے۔ میرے لئے نہیں۔ اپنے لئے اپنے بال بچوں۔ آل اولاد کے لئے پنجاب میں اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کے فضول بیہودہ اور لایعنی جھگڑوں کو ترک فرما دیجئے۔ اس سے قوم و ملت کو نقصان کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اپنے اپنے مقام کی بولیاں لازماً قائم رہنا چاہیں۔ اُن کی ترقی میں حائل نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اُردو کے لئے سب کو سینہ سپر ہو جانا ضروری ہے۔ اس زبان کا گلا کاٹنے کے لئے ہندوؤں نے چند مسلمانوں کو بھی خرید رکھا ہے۔ اُن کے بھرّے میں نہ آیئے۔ رہ گئے چودھری شہاب الدین۔ وہ جتنے جسم موٹے اور کالے ہیں اتنی ہی ان کی عقل موٹی اور دل کالا ہے۔ اُن کی پنجابی شاعری۔ مسدس حالی کے بھونڈی پنجابی میں ترجمہ تک محدود ہے۔ وہ میونسپل کمیٹی کے صدر ہوں۔ یا لاٹ صاحب بن جائیں اُن کی پنجابی اختیار کروانے کی منافقانہ شر ہرگز نہ چلے گی۔

اُردو زبان کو ہزار برس میں ہندوؤں مسلمانوں عیسائیوں دیسیوں بدیسیوں نے مل کر ایک مہذب اور علمی زبان بنایا ہے اور اس قابل کر دیا ہے کہ ہندوستان کی ان گنت مختلف قومیں اس کے ذریعے میل جول محبت اور یگانگت کے سلسلے کو مضبوط کرتی ہیں۔ اور یہ تفرقہ انگیز سیاست ہے۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو شودر چنڈال بنا دینا ہے۔ گاندھی مہراج لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اُردو کا رسم الخط مسلمانوں کو قرآن کی طرف کھینچتا ہے۔ اُس لٹریچر کی طرف بھی جو فارسی میں ہو یا اُردو میں سب میں مسلمان کو قرآن ہی نظر آتا ہے۔

یہ سب کچھ آپ مسلمان کہلوانے والوں کے سامنے ہے ـــــ کیا آپ ذہنی اندھے ہیں ـــــ!

پانچ اشعار کا انتخاب،

پیارے ممتاز حسن جی   السلام علیکم !

ارشاد یہ ہے کہ میں فقط پانچ ایسے شعر آپ کو لکھ کر بھیج دوں جو میری تخلیق نہ ہوں۔ میں نے پڑھے یا سُنے ہوں۔ اور ایسے پسند آئے ہوں کہ اُن کو اب تک حرزِ جاں بنا رکھا ہو۔ ذہنی و رُوحانی زندگی پر مسلط پایا ہو۔

یہی نہیں بلکہ آپ ان پانچوں شعروں کی پسندیدگی کا اصل سبب بھی مجھ سے حاصل کرنے کے تمنائی ہیں۔

آپ نے بار بار مجھے اپنی فرمائش جلد پُوری کر دینے کے لیے لکھا، زبانی بھی کہا۔ میں نے زبانی اور تحریری وعدہ بھی کیا کہ تعمیل جلد ہو گی۔

یہ لکھتے اور کہتے وقت ایک صاحب ہیں۔ جن کا نام نامی حضرتِ دل ہے۔ ان صاحب نے ہر مرتبہ یہی کہا کہ بات ہی کیا ہے؟ جب چاہوں گا پانچوں شعر اپنی یادوں کی گُتھلی سے نکال کر آپ کی زبانِ قلم پر رکھ دوں گا۔ اور کیوں پسند ہیں؟ ان میں کونسی خوبی ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں گا۔ دل صاحب میرے جنم کے ساتھی ہیں۔ میں ہمیشہ مان جاتا رہا۔

آج آپ کی ڈانٹ کا مکتوب آیا تو قلم اٹھایا۔ لیکن اب :۔

"جی نڈھال ہے فرقتِ یار میں"

سر در گریبان ہوں۔ جس تعمیلِ ارشاد کو میں بہت ہی آسان بات سمجھا تھا، اب بہت

پانچ اشعار کا انتخاب

ہی مشکل بلکہ محال نظر آتی ہے۔ پیش پا افتادہ تاثرات آج اہم ترین دشوار گذار مہمات میں سے ہیں۔ خدارا یقین کیجیے زندگی کی سب سے بڑی فکر مجھ پر آن وارد ہے۔

جانِ برادر! آپ سنتا ہوں یا رحم فرمائیں میں آپ کے طلب فرمودہ پانچ شعر اور ان کے بارے میں کچھ بھی لکھنے کی بجائے اعترافِ شکست کر رہا ہوں۔

مجھے تو کوئی ایک شعر بھی ایسا یاد نہیں آ رہا جس کو میں نے زندگی پر محیط کیا ہو اور ذہن کی رگوں میں بسا لیا ہو۔

کاروانِ حیات میں شامل ہونے کے آغاز سے ہر قدم پر کوئی نہ کوئی شعر نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا آتا آ کر رفیق راہ بنتا گیا تھا ان میں سے اکثر ساتھ ساتھ دائیں بائیں بلکہ آگے آگے چلتے تھے اس طرح گھل مل کر رفاقت کا حق ادا کرتے نظر آیا کرتے تھے۔ جیسے میں اور وہ 'جان و تن شدیم' ہیں۔

لیکن کسی نہ کسی مرحلہ پر، کسی نہ کسی دور میں اُن میں سے باری باری سب، یاد اللہ کیے بغیر نہ جانے کیوں منہ پھیر لیتے تھے۔ کہاں چل دیتے تھے؟ حالانکہ رفاقتِ سفر میں ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ آخری منزل تک یہ میرے ساتھی، میری جدائی گوارا کر ہی نہیں سکتے۔ ایسے کتنے تھے؟ اب میں کیا کہوں آج میرے جان و تن تو رہ گئے اور وہ سب کے سب چلتے چلاتے خود بخود گم شدن کی ادا دکھا چکے ہیں۔

جہاں بھی ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں قدم رکھا، جہاں بھی ایک نئی اُفتاد کا مزہ چکھا یہ اشعار یہ آگے آگے چلنے والے، یہ ساتھ ساتھ رہنے والے رفیقانِ نامدار ہولے ہولے آہستہ آہستہ پیچھے ہی پیچھے ہونے لگے۔ پکارنے اور پلٹ پلٹ کر ڈھونڈنے پر آئے بھی تو منہ چھپاتے ہوئے، سر جھکائے ہوئے

پانچ اشعار کا انتخاب

ہائے ہوئے، تھکے ہارے نہ جانے خود بخود راہ کی مات کھائے ہوئے تھے۔
پنڈی چڑھ جانے پر بھی ساتھ نباہنے سے معذور اب جلد جلد دور رہی دور ہوتے
غائب

نہ کوئی لڑائی نہ کوئی فساد، نہ تو تو، نہ میں میں

بہت سوچا بہت ذہن لڑایا۔ تو غور و فکر نے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ رفیقانِ سفر یہ دوسروں کے اشعار صاحبان اپنی اپنی ولایت تک تو ساتھ دیتے ہیں راہِ سلوک اپنی حد تک تو منزلیں طے کرا دیتے ہیں اور پھر الوداع کہے بغیر کھسک جاتے ہیں۔

جسمانی رفیقانِ راہ سے تو یہ ذہنی و روحانی ساتھی میرے حوصلہ افزا ہمقدم تھے۔ بہ حُسن و خوبی میرے ہم خیال رہتے تھے اور ہم مقال بھی۔ ہم میں کبھی کوئی تفرقہ نہ تھا۔ نہ انھوں نے مجھے کبھی سخت سُست کہا۔ نہ میں نے کبھی ان کو رد کا ٹوکا۔ بیٹھ گئے تو میرے ساتھ لیٹا ہوں تو میرے ساتھ۔ دماغ سو گیا تو یہ دل میں جاگزین مجھے سُلانے کے عادی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار سالکانِ مراحلِ تصوف تھے۔ اور یہ مسائل ایسے ہیں جن کا حل اولیاء اللہ ہی سے ممکن ہے۔

حکم کی تعمیل اس طرح تو ہو سکتی ہے کہ اگر میں دوسروں کے ۵۰۰ شعر جمع کر کے پریڈ کے لئے ان کو سامنے صف بصف کھڑا کر لوں۔ اور ان میں سے پانچ کو چُن لوں۔ ان کی شکل و صورت، کی وضع قطع کی خیال و حسن و جمال کی مدح بھی کر ڈالوں تو بقیہ ساری فوجِ ظفر موج ۴۹۵۔ اشعارِ باوقار و جرار مجھ نحیف نزار پر پل پڑیں گے۔ نا بابا! میں ان کی مار سہ نہیں سکتا۔ البتہ ایک شعر ہے جو بچپن میں مسجد کو اٹھے نماز کے لئے جاتے ہی دیوار پر نظر آتا تھا۔ اور آج بھی کبھی کبھی کسی پرانی مسجد میں

پانچ اشعار کا انتخاب

دو سجدے کرنے جاؤں تو یہ دو مصرعے میری نگاہوں کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ ایک شعر اب تک میری گردن کا ہار ہے۔ لکھے دیتا ہوں۔ ؎

؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

یہ خط ممتاز حسن کے نام تھا۔ ممتاز میرے دوستوں کی صفِ اوّل میں تھے۔ لاہور ہو یا راولپنڈی وہ اپنے عہدہ کی کارفرمائی کے لئے جب بھی آتے میرے غریب خانے پر دوستوں کی محفل جمتی۔ شعر و شاعری کے ساتھ اُن گِنت علمی اور ثقافتی امور کے علاوہ لطیفہ گوئی ہوتی۔ گذشتہ سال ان کو خدا نے یاد فرمالیا۔ وہاں سے مَیں ان کو پلٹا نہیں سکتا۔ ہاں جہاں وہ ہیں وہاں جانے کی گھڑیاں گِن رہا ہوں۔

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ
دُنیا چلی گئی مری دُنیا لئے ہُوئے

جالندھر کا بہشتی دروازہ

دُنیا مکافاتِ عمل ہے. آپ سب جانتے ہیں. جو بوؤ گے وہ کاٹو گے. یہ بات مَیں نے جالندھر میں نو دس برس کی عمر میں سُنی تھی. جالندھر میں ایک چھوٹی سی خانقاہ بہشتی دروازہ کہلاتی تھی. اغلباً یہ بہشتی دروازہ پاک پتن کے مقابلے یا تقلید میں بنایا گیا تھا. یہ ایک بزرگ سیّد علیم اللہ شاہ کا مزار تھا. جو شہر جالندھر سے چھاؤنی جالندھر کی طرف جاتی ہوئی تین سڑکوں میں سے درمیانی شاخ پر ایک چھوٹے سے مقبرے، چند درختوں کے باغ، دو تین مجاوروں کے رہائشی حجروں پر مشتمل آدھے ایکڑ زمین پر واقع تھا.

یوں تو وہاں چڑھاوا، نذر نیاز چڑھتا ہی رہتا تھا. ایک خاندان جالندھر کے سادات میں سے اس مزار کا مالک اور متولّی کہلاتا تھا. اس خاندان کے متولّی ارکان نے اس بہشتی دروازے پر کچھ سائیں لوگ بٹھا رکھے تھے. خود یہ خاندان شہر جالندھر کے محلّہ سادات کے ناکے پر ایک حویلی میں تشریف فرما تھا. مَیں اپنے لڑکپن میں اس حویلی کی قریبی سڑک پر گزر کر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ گیند بلا کھیلنے کمپنی باغ کی طرف جاتا ہوا اس خاندان میں سے اکثر کو

ان کی بیٹھک میں تاش یا چوکڑی کھیلتے ہوئے رشک سے دیکھا کرتا۔ رشک اس لئے کہ تاش نہیں مگر چوکڑی کھیلنے کو میرا بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن میرے ابا اور دادا کی گھرکیاں میری تمنا کو حسرت میں تبدیل کر دیتی تھیں۔ البتہ اس خاندان کی "بیٹھک" میں بٹیروں کی پنجریاں ایسی تھیں کہ میں نے بھی لڑکپن میں بٹیر خریدے اور لڑائے۔

ذکر تھا جالندھر کے بہشتی دروازے کا۔ اس مزار سے سائیں لوگوں کے ذریعے آنے جانے والوں اور منت ماننے والوں اور ماننے والیوں سے ہر روز جو یافت ہوتی تھی یہ خاندان ہر شام وصول کرتا اور آپس میں بانٹ لیتا تھا۔

دوسرے سید خاندان ان کی اس یافت سے مزہ اڑانے کے مخالف مشہور تھے اگرچہ ان کے ہاں بھی اسی طرح مرغ اور بٹیر کی پالیاں لگتیں، تاش دن بھر کھیلے جاتے۔ ہفتہ عشرہ قوالیاں ہوتیں اور ان قوالیوں میں ادھر سے گزرتے ہوئے ہم نوخیز لڑکے ایک دو گھڑی مرہلانے کی نقل بھی کر لیتے۔

بہشتی دروازے والے بزرگ علیم اللہ صاحب اگر اس خاندان کے بزرگوں میں سے تھے تو ان کی عبادت و زہد و تقویٰ کا ثواب تو ان کی ذات عالی صفات نے دوسری دنیا میں لے لیا ہو گا یا حشر کے بعد جب وہ جنت میں قدم رنجہ فرمائیں گے تو وہاں بھی جو چاہیں گے پائیں گے لیکن ان کی قبر پر چھوٹی سی گنبدی بنا کر ایک دروازہ داخلے کا اور دوسرا خارجے

کیلئے تعمیر کرنا اور اسے بہشتی دروازہ مشہور فرمانا، مجھے یقین نہیں کہ اُن بزرگ کی ہدایت پر کیا گیا ہو۔ بہر حال یہ تھا ——

ملحوظ رہے کہ یہ ایک فقیر روشن ضمیر کا مزار تھا جس کے اوپر ایک چھوٹی سی گنبدی تھی چار دیواری میں دو دروازے تھے جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں ایک داخلے کا دوسرا خارجے کا۔

یہاں سال بسال تین دن میلہ لگتا جس کو بہشتی دروازے کا میلہ کہتے تھے۔ ہمارے شہر اور ارد گرد کے دیہات سے بے شمار لوگ اس میلے میں آتے۔ میری یاد غلطی نہیں کرتی تو محرّم کی پانچویں تاریخ کو یہ میلہ شروع ہوتا تھا۔

عقیدتمند، مُرادیں مانگنے والے، مَنّت گزار، مَرد ہوں یا عورت، بھیڑ بھڑکّے میں سے گزرتے ہوئے اس گنبد کے نیچے بنی ہوئی چھوٹے پکّی قبر کے قریب سے گزرنے کے لئے ایک دروازے سے داخل ہوتے، جھکتے، اپنا ماتھا مزار پر رگڑتے اور ساتھ ہی اپنی بساط، اپنے ظرف، عقیدت کے مطابق رُوپے پیسے، بالیاں، چوڑیاں چڑھاوا چڑھا کر دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔

اس طرح داخل ہو کر نکل جانے والا یا نکل جانے والی اپنے آپ کو بہشتی بھائی اور بہشتن مائی سمجھ لیتے تھے، یقین کر لیتے کہ ہمارے سب گناہ دُھل گئے ہیں اس طرح جیسے نہا لینے سے مَیل اتر جاتی ہے۔ ہم نے جو مال مارا ہے، لوگوں سے بدیاں کی ہیں اُن سب سے ہم پاک

ہو گئے۔ اب آج سے نئی زندگی شروع ہوئی ہے۔ اسی خاطر یہ آتے اور پھر اپنی اپنی پرانی راہوں پر بالکل اطمینان کے ساتھ رواں ہو جاتے۔

جالندھر کے دوسرے میلوں میں یہ سالانہ میلہ بھی بڑی ہی طرح کا تھا۔ چونا ملی ہوئی شیرینی۔ پیروں سے اڑتی ہوئی گرد سے آلود پکوڑے، کھانڈ چڑھے ہوئے چنے جن کو اڑتی ہوئی مٹی نے خاکی رنگ بخش دیا ہوتا تیل میں تلی ہوئی مچھلی کے قتلے جن کے اندر مچھلی کم اور بیسن لپٹا ہوا زیادہ۔ ناخالص گھی میں تیار کردہ مٹھائیاں، مونگ پھلی کے روغن میں تلے ہوئے میدے کے مضبوط و ہالاٹ قتلے، مکھیاں بھنکتی ہوئی جلیبیاں، گاؤ میش کے قیمے کے اندر رندھی اور گوندھی ہوئی مرچیں، پیاز نمک آمیختہ سیخوں پر چڑھے ہوئے ادھ کچے سیخ کباب، لوہے کے تھالوں میں گائے بھینس کی چربی میں بھنی ہوئی گائے بھینس ہی کے قیمے میں گندھے ہوئے بھونے چنے کی گول ٹکیاں، پیسے گلاس گڑ کا شربت جو، پر نوسر کے مطابق مکھیوں اور بھڑوں کے ہجوم اور ان کو اڑاتے ہوئے پینے والوں کی ریل پیل۔

اِدھر اُدھر سڑک کے دونوں کناروں پر تماش کی بازیاں دکھاتی ہوئی نوسربازوں کی ٹولیاں۔ "ایک پیسہ لگاؤ پچاس پیسے لے لو" کے نعرے۔۔۔ دیہاتی ہی نہیں بلکہ شہری بھی مسلسل پیسے لگاتے ہوئے، ہار جیت مناتے ہوئے ہجوم —— یہ تھا بہشتی دروازے کا میلہ ——!

لیکن میں نے قلم اس میلے کے لئے نہیں اُٹھایا۔ یہ تو آج بھی ہر جگہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کون سا مقام ہے جہاں ایسی درگاہ نہ ہو جس

کے اِرد گِرد سال میں ایک مرتبہ عُرس کا میلہ نہ لگے اور وہاں کم و بیش ایسا ہی کچھ نظر نہ آئے۔ نہیں یہ نہیں، میں تو کچھ اور کہنا چاہتا ہُوں۔

"جو بیجیں گا سو وڈھیں گا۔ جو بیجیں گا سو وڈھیں گا" یہ صدائیں تھیں جو اِس میلے میں سڑک کے دونوں کناروں سے ہر گزرنے والا سُنتا تھا اور لوگ ہجوم اندر ہجوم گزرتے اور پلٹتے تھے۔

"جو بیجیں گا اوہو ای وڈھیں گا" یعنی تُو جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ یہ آوازیں کمپنی باغ جالندھر سے نکل کر درگاہ تک پہنچتے پہنچتے قدم قدم پر سڑک کے دونوں کناروں سے سُنی جاتی تھیں۔ چھاؤنی والی بڑی جرنیلی سڑک پر جہاں یہ درمیانی شاخ جا ملتی تھی، وہاں سے بھی لوگ ان آوازوں کو درگاہ تک آتے اور بہشتی بن کر واپس پلٹتے ہوئے سنتے تھے۔ یعنی "اے اِنسان جو بہشتی دروازے سے گزرنے کو جا رہا ہے، سمجھ لے کہ آج جو تُو بوئے گا، اس کا پھل تجھ کو ویسا ہی ملے گا۔"

یہ آوازیں کوئی فرشتے ہماری آنکھوں سے پوشیدہ رہ کر نہیں دے رہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر چٹائیاں یا بورئیے بچھائے ہوئے اچھے خاصے تنگ دھڑنگ ملنگ لوگ مرد زیادہ عورتیں کم، بیٹھے ہوئے دین کی یہ تلقین مسلسل کرتے دکھائی اور سنائی دیتے تھے۔ میری عمر دس برس کی ہوگی۔ میں بھی لازماً اس میلے میں جاتا اور اس صدا کو سنتا ہُوا مٹی ملے کباب یا ایک آدھ جلیبی کھا کر نظارے کے مزے اُڑاتا گھر پلٹ آتا۔ بہشتی دروازے میں اس لئے داخل نہ ہو سکا کہ اس بھیڑ بھڑکے سے میری

جان جاتی ہوئی گھبراتی تھی۔

"جو بیجیں گا سو وڈھیں گا۔" یہ ملنگ لوگ چیخ چیخ کر سناتے تھے۔ کوئی چرس پیتا تھا کسی کے پاس بھنگ کی کونڈی گھٹکا نظر آتا تھا۔ اور میں دیکھتا تھا کہ ان کی چٹائیوں پر، بچھے ہوئے بوریوں پر روپے تو نہیں البتہ کوڑیوں پیسوں، دھیلوں، دوانیوں، چوانیوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں چاندی کی بالیوں مرکیوں اور ہمہ قسم کے غلوں کے ڈھیر لگتے جاتے تھے۔

یہ تھے بیج جو ہم مسلمان بہشت میں جانے اور وہاں پر جو کچھ ملے گا پھل پانے اور حظ اٹھانے کیلئے بیج کی مانند بویا کرتے تھے اور سب کو یقین تھا کہ یہی کاشت ہے جو ہمارے لئے پھل لائے گی۔ جس طرح ایک سیر گندم بو کر ہم ایک من وزن کا گیہوں انبار کر لیتے ہیں۔ اِن بھنگ پینے والوں چرسیوں جواریوں کی ملنگانہ صداؤں اور ذرائع سے وہ سب کچھ ملنے کا یقین ہمیں جالندھر کے اِس میلے بہشتی دروازے میں حاضری دینے سے مِل جایا کرتا تھا۔

دنیا مکافاتِ عمل ہے یہ میں کیا آپ سب جانتے ہیں۔ یہ شعر بھی بہت مشہور ہے ؎

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید، جو ز جو

اگر آج اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کی عصمت اپنے ہی اسلامی ملک میں محفوظ نظر نہیں آرہی، اگر مسلمانوں کی نرینہ اولاد کعبے سے روگرداں ہو کر چھلانگیں لگاتی ہوئی سفید یا سرخ رنگوں کی تباہی کے گڑھوں میں کودتی جا

رہی ہے اور دُختریں حیا کو خیرباد کہہ رہی ہیں۔ اگر جُوا، زنا، شراب، جھوٹ فریب، دغابازی، چوری، مکّاری، ڈاکہ، قتل و غارت، بیٹیوں بہنوں کی عصمت دری، ننھے بچوں کا اغوا، اسلامی ملک کے اندر مبارک ماہ رمضان میں بھی ترقی پذیر ہی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ اگر دین دار دکھائی دینے والے تاجر ہوں یا گاہک، جھوٹ بولتے اور دولت رولتے ہیں۔ اگر اُن سے کہا جائے کہ آپ تو نمازی ہیں بیوپار میں جھوٹ کیوں بولتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ نماز دین ہے اور تجارت دنیا۔ ہم دین اور تجارت کو اپنے اپنے مقام پر رکھتے ہیں ـــــ۔

یہ ہیں اس کاشت کے پھل۔ اگر واقعی ان صاحبان کے جوابات یہی ہیں۔ جوابات کچھ اور بھی ہوں عمل یہی ہے، معاملات یہی ہیں۔ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ اگر اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں، تو آپ ہی ارشاد کیجئے کہ یہ سب کیا ہے۔ ؟

یہ ہے اس زہریلی کاشت کا پھل جس کے بیج ہم سب نے نادانستہ اچھے بیج سمجھ کر حاصل کئے تھے، اور اُن بیچنے والوں سے خریدے تھے جو نادانستہ نہیں دانستہ ہمیں ان بیجوں کے سلسلہ وار بونے کی تلقین کرتے تھے اور یہ بیج دانستہ بڑے دعوے کے ساتھ ان لوگوں کی جھولیوں سے ملتے تھے جن کی نیت یہی تھی کہ ملت برباد رہے۔

یہ میں کیوں لکھ رہا ہوں اور کیوں اپنے لڑکپن کے وہ نقوش آپ کے سامنے لا رہا ہوں جو اب تک میرے ساتھ ہیں اور میں ان کو چھوڑے بغیر

جا نہیں سکتا۔ خود میرا اپنی ہی ذات سے سوال ہے کہ یہ کیا ہے؟ زہر یا شہد؟ اگر مجھے معلوم ہو جائے تو یہ بتانا بھی میرا فریضہ ہے۔ تاکہ آپ کو میرے اُس دور کے آئینے میں خود اپنی ذہنی شکلوں صورتوں کے بناؤ تناؤ بگاڑ، سنوار کا اندازہ خود بخود ہو جائے۔ اور اگر آپ چاہیں تو اس سے فائدہ بھی اٹھائیں اور اگر یہ باتیں آپ کے عقیدوں کے خلاف ہوں تو میری قبر پر وہ گالیاں لکھ جائیں جن کے آپ عادی ہیں۔ کیونکہ مجھے بھی اپنے اس تحریری بیج کا پھل ملنا چاہیئے۔

غالبؔ

جناب طفیلؔ کا مکتوب ۱۴ فروری ملنے کے بعد سے کشش و پنج ہی کا عالم رہا۔ علالت بھی ہے گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل کی حالت بھی۔

طفیلؔ صاحب طالب ہیں غالبؔ کے بارے میں اظہارِ رائے کے۔ اور موضوع ایسا ہے کہ احساسِ ذمّہ داری اب اپنی اختیار کردہ خاموشی نامناسب اور طفیلؔ کی خفگی کو ناقابلِ برداشت قرار دیتا ہے۔

خفگی میکدے والوں کی الٰہی توبہ
کوئی خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

غالبِ نکتہ سرا کی اُردو غزل کے بہت سے اشعار کو سمجھنے سمجھانے کا دَور خود غالب کی جسمانی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ سلسلہ بڑھتا ہوا ہم سب تک پہنچا۔ اور اب ہم سیلاب کی صورت اس کو اپنے بعد کے آنے والوں تک پہنچا رہے ہیں۔

گزشتہ دو تین برس میں انواع و اقسام کا مواد غالبؔ کے مبحث نے اپنے دامن میں بھر رکھا ہے۔ طفیل کی پیروی نے فہمیدِ غالبؔ کی راہوں میں

ہر موڑ، ہر نکڑ پر جلوہ خانے، آرائش کدے، نمائش گاہیں قائم کردی ہیں جو اپنی اپنی ستائش حاصل کر رہی ہیں۔ ان سب کو مکتفی نہ جان کر یہ شمارہ ایک ایسا قدم ہے۔ جس کے مقصود کی وسعت مجھے تو غیر محدود نظر آتی ہے۔ کیونکہ شاعر کی بات شاعروں کی "پسند" تک پہنچادی گئی ہے۔

ایک صدی سے شارحوں، مبصروں، ناقدوں، معترضوں، مداحوں اور جراحوں کی رنگا رنگ کاریگری کے جو مٹیے ٹیلے انبار اور مینار غالب کی راہوں میں سجے رکھے ہیں۔ ان کے چڑھاؤ آثار ہی سے قلب و نظر کو کسی طرف کھسک جانے کی راہ نہیں مل رہی کہ اب یہ شمارہ ایک ایسی ایجادِ نو کا آغاز نظر آتا ہے جو ہمالیہ سے بھی بلند و بالا مدح و مذمت کی دشوار گذار گھاٹیوں کا لامتناہی نظارہ پیش کرے گا۔

میرے اس تاثر کا سبب طفیل کا یہ سادہ مکتوب ہے جو بظاہر تو ایک سرسری استفسار ہے۔ لیکن ایسا اہم اور وقیع کہ متوقع "جوابات" ہمارے شورِ شعر و ادب کو گذشتہ اور آئندہ سے پیوستہ لام ڈوری بنا دیں گے۔

طفیل کے مکتوب کی پیشانی پر "موضوع" کا یہ ستارہ مجھے سب سے پہلے دکھائی دیا۔ :

اس عہد کے شاعروں کا غالب کے بارے میں اظہار رائے۔

(بہ حیثیت شاعر)

سارا خط سرسری نگاہ سے پڑھ لینے کے بعد دوبارہ آغازِ مکتوب پر غور کیا تو خطوطِ وحدانی کے نیام میں (بہ حیثیت شاعر) دو دھاری شمشیر نظر آئی۔

جس کے دونوں "دم" جذبۂ شوق کی شدّت نے سینے سے باہر جھلکار کھے ہیں۔
اس تلوار کی ایک دھار کا رُخ غالبؔ کا طالب ہے۔ کس غالب کا --- ؟
عالم، فاضل، مفکّر، فیلسوف، بذلہ سنج، ولی، بادہ خوار، قصیدہ گذار، بے
تیشہ کوہکن، سہرا نویس، سپہ گری پیشہ، مخاطب بہ خطاب نوّاب اسد اللہ
خاں غالبؔ کا نہیں۔

فقط غالبؔ بہ حیثیت شاعر کا طالب

دوسری دھار کی زَد پر ہم سب ہیں۔ جو اس دور میں بھی "بحیثیتِ شاعر"
ابھی تک زندہ نظر آتے ہیں یا زندگی کے دَر پے ہیں۔ جنھیں غالبؔ کے حضور
اپنی اپنی گردنیں الگ الگ۔ اس شمشیر پر رکھ دینا ہیں۔ ہر حلقوم سے جو بھی صدا
پیدا ہو گی محفوظ کر لی جائے گی تاکہ اس دور کے شاعروں کی غالب فہمی سند رہے۔
معاذ اللہ، آیئے اب اس سادہ و معصوم ادیب مدیر کی عجوبہ کار شرارت
ملاحظہ فرمایئے :

" مندرجہ بالا عنوان کے تحت ہم اس دَور کے دسؔ بڑے شاعروں
کی رائے چاہتے ہیں تاکہ وہ محفوظ ہو جائے۔ "

دس لاکھ سے بھی زیادہ شاعروں میں سے محض دسؔ (نفر) کو بڑا بھی
اور شاعر بھی بتانا۔ ایک ایسا لاجواب آمرانہ انتخاب ہے جس سے داخلی و
خارجی دنیائے سخن میں صریرِ خامہ کی ایسی ہنگامہ آرائی مرتب ہو گی۔ جو سیاسی
معرکہ آرائی کی مانند کسی آرڈیننس سے ختم نہ کی جا سکے گی۔ میری پیش گوئی ہے
کہ چنے ہوئے یہ دس "منقوش" جن کو "نقوش" کے ایوان میں سجا کر دکھایا جائے

گا۔ صَف بہ صَف دس لاکھ محافظ دستوں کی تیر انگنی اور نیزہ بازی کا ہدف نظر آئیں گے۔ یہ چاندماری تسلسل اختیار کرے گی۔ اور صحیفۂ نقوش اپنے صفحات کو میدانِ کارزار نہ بھی بننے دے جب بھی طفیل کے حاسدِ ادب کے مفاسِد کے لئے ہرگز ہرگز اپنی چار دیواریوں کے در بند نہیں رکھ سکتے۔

ہر چہ باداباد۔ دنیا ہاؤ ہُو ہی سے تو آباد ہے۔ کاش اِتنا پوچھا جا سکتا کہ جواب دہی کے لئے میرے نَو ماخوذ ساتھی کون کون ہیں۔ نیز مجرموں کے اس کٹہرے میں میرا نمبر اوّل ہے یا دَہم ؟

ایک اور کاش یہ ہے کہ اگر میں اس دَور کے کسی ایسے زندہ شاعر کو جانتا جسے ہم سب کے سب نام زدہ "شاعرانِ کرام" اپنے سے بڑا مان کر واجب الاحترام گردان چکے ہوں۔ تو میں بڑائی کے اس ہولناک الزام سے بَری ہو جاتا لیکن شاعری کی لنکا میں تو سب باون گزے ہیں۔ میری کسرِ نفسی منافقت سمجھی جائے گی۔ لہٰذا اپنا ہی شعر لکھے دیتا ہوں۔ ؎

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرّہ ہوں آفتاب نہیں

طفیل جی! یاد رکھئے گا، شاعر کوئی بھی ہو کسی بھی دوسرے شاعر کو اپنے سے بڑا نہیں مانتا۔ کون سی ایسی ماں ہے جو اپنے جنے ہوئے بچے کو دوسری ماں کے بچّوں سے کم تر مان لے۔ محض مصلحت کی اور بات ہے یہ مصلحت بربنائے منافقت ہی دیکھی گئی ہے۔

اب میں اس مکتوبی مرحلے کے آخری سنگِ میل پر ہُوں، جس کا اشارہ غالب نمبر

کہ اِس شمارے کی اصل منزل ہے۔ ارشادِ طفیل یہ ہے کہ :

"اِس شمارے میں بہت سے نوادرات ہوں گے۔ ہر چند غالبؔ
پر بہت کچھ چھپا ہے اس کے باوجود ہم (نئی) دریافتیں ہی لائیں گے۔
سبحان اللہ۔ کسی سے مخفی نہیں کہ یہ ادیب ندرت پسند مدیرِ نقوش محمد طفیل، اتنی مشقت، اتنی تلاش اور کاوش نیز اتنے اخراجات سے چند بیش پا اُفتادہ خزف ریزے جمع کرنے والی ابہامی تو ہے نہیں۔ اس شمارے کو نوادرات کا عجائب گھر تو بننا ہی ہے۔ لہٰذا اچھی بات ہے۔ کم از کم دس عدد شاعروں کی رائیں تو نئی دریافتوں کے پہلو بہ پہلو آویزاں نظر آئیں گی۔ اور مجھے بھی یہ دیکھنے کے لئے جینا پڑے گا کہ میرے نو عدد ساتھیوں میں کون میرا فرمایا ہوا سند مانتا ہے۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اب میں (بحیثیت شاعر) اپنی زندگی کے سب سے اہم اور مخدوش مقام پر ہوں ہنستا بولتا اپنی علالت کی حالت میں بھی آپ کو یہاں تک لگا لایا۔ آیئے اب آپ جس کے طالب ہیں۔ ایسی مرزا غالبؔ کے بارے میں اپنے دَور کے اِس پنجاب نژاد اُردو شاعر کا اظہارِ رائے گوارا فرمایئے :

(غالبؔ بہ حیثیتِ شاعر) فارسی اور اُردو زبانوں کے ذریعے اظہارِ خیال پر قادر اُن چند گنے چُنے بلند ترین سخنوروں میں سے ہے جو ہمارے معاشرے

پر چھائے ہوئے اور ہمارے ذہنوں میں سمائے ہوئے ہیں۔

میرا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے سوا کوئی بھی ایسا کلام نہیں جس میں پست و بلند نہ ہو۔ میں غالب کو فارسی زبان کے اُن شاعروں کی محفل میں دیکھتا ہوں جو ایک دوسرے کو اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کا طرزِ بیان الگ اور منفرد ہے۔ مگر ایک دوسرے کی تحسین میں اس لئے کمی نہیں کرتے کہ یہ سب واقعی اہلِ کمال ہیں۔ آفتاب دوسرے آفتاب کو تاریک نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ہوتا ہے۔ تاہم کسی کا بھی سارا کلام یکساں بلندی کی سطح پر نہیں۔ خیال اور اظہارِ خیال کی پستیاں بھی موجود ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ ــــ

میں دیکھتا ہوں کہ رودکی، سعدی، انوری، ظہوری، خسرو، حافظ، نظیری، طالب، کلیم، غنی، صائب، بیدل، گرامی یہ سب ایک بزمِ مشاعرہ میں موجود ہیں۔ غالب اپنا کلام سُنا رہا ہے اِن سب کا ہم نشین ہے اور مرجعِ تحسین!..

میرے نزدیک یہ ہے اصل غالب، فارسی کا شاعر ــــ! زبان کوئی بھی ہو، دوسروں سے الگ نیا اندازِ سخن پیدا کرنا اس زبان کے مزاج کو بھی ملحوظ رکھنا یہ ہے سخنوری ــــ!

غالب کا فارسی شعر دماغ میں اُلجھتا نہیں تیر کی مانند سیدھا دل میں اُترتا ہے۔

از دل خیزد بر دل ریزد

اب میرا تصور اُردو زبان کے ذریعے اظہارِ خیال کرنے والے مشہور شاعروں

اور غالب کو مشاعرے میں دیکھتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کے صفحوں پر بٹھائے ہوئے اساتذہ موجود ہیں۔ سودا، میر تقی، میر درد، جرأت، انشار، مصحفی، ناسخ، مومن، ذوق اور ان سے کم عمر داغ اور حالی بھی شامل ہیں۔ شمع سب کے سامنے آتی ہے۔ میں مولانا حالی کے ساتھ آیا ہوں۔ سب کا کلام سُن رہا ہوں۔ ان میں کوئی ایسا نہیں جس کو سب نے سُنا اور سر نہ دُھنا ہو۔ آخر میں غالب کی باری آتی ہے۔ غالب غالب ہونے کے لئے نہایت جوش و خروش سے اشعار سناتے ہیں۔ مگر اب داد و تحسین میں وہ جوش و خروش موجود نہیں رہا۔ کچھ لوگ چُپ ہیں۔ کچھ ایک دوسرے کے کان میں کھُسر پھُسر کر رہے ہیں۔ غالب پہلو بدلتا ہے زیادہ جوش سے شعر سناتا ہے۔ کچھ لوگوں کے منہ سے واہ سُبحان اللہ کے الفاظ نکلتے ہیں۔ لیکن ایک آواز اور بھی میرے کان میں آتی ہے: ع

اجی — اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خُدا سمجھے

یہ تصوری مشاعرہ ختم ہوتا ہے لیکن حالی اور ان کے ساتھ ایک بزرگ ہیں جن کا نام شیفتہ ہے، اس محفل سے نکلتے ہیں۔ میں دونوں کے پیچھے پیچھے اور ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ ان کی گفت و شنید کا نچوڑ یہ چند فقرے ہیں۔

اِتنے بڑے عالی نظر اور فلک پیما کو اُردو غزل کہتے ہوئے اُردو زبان کی نزاکت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔
فارسی صنائع بدائع اور تلازمات اور اصطلاحات کی نمائش اور آرائش سے بے چاری اُردو غزل کو

لا دنیا فن کی محض "نمود" کے سوا کچھ نہیں ہے۔'

آپ نے رائے طلب کی تھی یہ تصوراتی جائزہ میری اپنی رائے ہے۔

مرزا غالب اُردو زبان کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ غزل کے علاوہ ہر صنف ہر موضوع نظم ہو یا نثر، غالب کی سخنوری پاکیزہ ترین، شگفتہ اور کوثر سے دُھلی ہوئی اُردو میں ہے۔ مگر اُردو غزل کہتے وقت وہ اپنی فارسی دانی اور تلازمات کو استعمال کرنے کی دُھن میں بھول جاتے ہیں کہ اُردو کا مزاج فارسی سے جدا گانہ ہے۔ ؎ کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو

جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

غالب اُردو غزل کہتے وقت فارسی تراکیب اور اصطلاحات کیوں اختیار کرتا ہے اس لئے کہ اس کو اپنی پرواز خیال اور اپنے تصوّر کی صورت گری میں، سادہ اُردو الفاظ کا استعمال گھٹیا اور پھیکا نظر آتا ہے وہ اپنے ہمعصروں سے بازی بھی لے جانا چاہتا ہے۔ اس بازی لے جانے کے زور میں جہاں کامیاب ہو جاتا ہے اس کا شعر لاجواب ہے۔ جہاں ناکام رہتا ہے۔ ع مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا خود ہی فرماتا ہے۔ اور بظاہر مطمئن نظر آتا ہے۔

میر تقی، میر درد، مومن اور حالی کے اشعار جس طرح چشم و گوش کے زینہ سے ہمارے صدور سینہ میں رس بس چکے ہیں۔ اُسی طرح غالب کے بہت سے اشعار ہمارے دَور کے سخنوروں اور سخن فہموں کی زندگی کا حاصل ہیں۔ یہ اشعار ہمارے ہمنوا ہیں۔ تعدد موضوعات پر ہمارے مؤیّد

ہیں لہٰذا میں غالب کو میر، مومن اور حالی سے کم تر نہیں سمجھتا لیکن — بہتر و برتر بھی نہیں۔

ان شعرا میں ہر شاعر کا اپنا رنگ و اسلوب و طرزِ اظہار ہے۔ ہر شاعر کی نگاہ اپنی ہے ہر ایک اپنے رنگِ سخن کا "نابغہ" ہے۔

یقیناً غالب نے ہم سب کو وہ کچھ دیا ہے جو شاید ہم میں کوئی آنے والی نسل کو اِس رنگ سے نہ دے سکے گا۔ زمانہ بدل چکا۔ خیالات حالات کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں گے، اس کا فیصلہ ہمارا کام نہیں۔ تاہم بحیثیت شاعر یہ میرا فریضہ ہے کہ غالب کے بارے میں اِستفسار ہے تو پھر ایماندارانہ اظہارِ رائے کروں۔

دیوانِ غالب کے متعدد نسخے دیکھے ہیں۔ مُغلق اشعار فارسی کی اصطلاحات کی گٹھڑیاں ہیں، جو اُردو کی نزاکت پر بار اور سوار نظر آتی ہیں۔ اگر غالب کی یہ صنعت گری زیوراتی ہے تو ان زیوروں کو اِس طرح غزل کے ہر شعر پر لاد دیا گیا ہے کہ تغزل کی بجائے دیوانِ غالب "زیور فروش" کی دُکان نظر آتی ہے۔

... کہہ چکا ہوں کہ غالب کی زندگی ہی میں اس کی اُردو غزل کے بیشمار اشعار کو بے معنی، مُغلق اور مہمل کہا جانے لگا تھا۔ اس وقت سے اَب تک ے در پَے سخن گری اور سخن فہمی نے اپنی اپنی آرا ظاہر کیں۔ سلسلہ چلتا رہا ہم تک پہنچا اور اب ہم سیلاب کی طرح اس کو اپنے بعد آنے والوں تک پہنچانے کے درپے ہیں۔ اور نہیں مانتے کہ اُردو زبان میں غزل کہنے کے

لئے فارسی تلازماتِ شعر گوئی کا جو ذخیرہ غالب نے جمع کر رکھا تھا اس کو ڈھنگ سے برتا نہیں گیا۔ اپنے زورِ بداعت میں اس ذخیرے میں سے اٹھا اٹھا کر اردو کے چند الفاظ پر مار امار کر دی گئی ہے۔ یہ غزل کے شعر نہیں معمّے ہیں۔ ایسے اشعار شارحین اور مفسّرین کی بکر کوُد کے لئے ہوں تو ہوں، صاحبانِ مذاقِ سلیم ان پر ہنس دیتے ہیں۔

بھانت بھانت کے مُفسّر اور شارحِ پیدا و ہویدا ہیں۔ کتابوں اور مضامین کے ڈھیر لگا دیئے گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ غالب اِس خود ساختہ شیشہ گری سے چوُر چوُر ہو کر رہ گیا ہے۔

غالب کی عظمت جن اشعار سے ہے ان میں غالب کا کمالِ ہنر بحُسن و خوبی موجود تو ہے لیکن ہُنر کی نمائش نہیں۔ یہ اشعار دماغ میں اُلجھے بغیر کانوں اور آنکھوں کے ذریعے ہمارے دلوں میں اُتر گئے ہیں اور اب ہماری جان اور زبان ہیں۔ ان اشعار میں بلند سے بلند اور عمیق سے عمیق تصوّر کی صورت ایسی ہے۔ اُستاد نے غزل کے دو دو مصرعوں میں کائناتِ خداوندی آئینہ کر دی ہے یہی تخلیق تقویمِ احسن کہلانے والی مخلوق کے لئے زندہ و پائندہ ہے تا قیامت بلکہ بعد از قیامت بھی تابندہ رہے گی۔

اگرچہ غالب زندگی بخش نخوُر نہیں ہے اگرچہ وہ زندگی کے پروردگار کا بھی شکوہ سنج ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

لیکن اس کے وہ اشعار جو سہل اور ممتنع کی سب سے بے نظیر مثال ہیں کبھی مر نہیں سکتے۔

آیئے دیکھیں غالب کی اُردو اشعارِ غزل کی شرحیں کیوں کی جا رہی ہیں۔ کیوں غالب کی فارسی غزل کا کوئی شعر اپنے عمق اور بلندی کے باوجود قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرا؟ کیوں اس کی اُردو غزل کے بہت سے اشعار کے معنی جاننے کے لیے کنپٹی کھرچنی پڑتی ہے؟ اور کیوں اس کنپٹی کھرچنے کے بعد بھی شارحوں کی لن ترانی سُن کر رَبِّ اَرِنی کی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں؟ اس کیوں کا جواب فارسی کے بارے میں یہ ہے کہ غالب کا مزاج فارسی زبان کے مزاج کی تخلیق ہے۔ غالب فارسی ماں کا ایسا فرزند ہے جسے ہندی میں سپوت کہنا مناسب ہے لہٰذا اُس کے فارسی کلام کی شرح ہر شعر خود کر دیتا ہے۔

اُردو شرحیں غالب کی ہوئیں اور ہو رہی ہیں اس لئے کہ ہمارے معاشرے کا یہی عجوبہ ہے کہ گلی کوچے، بازار، تکیئے یا مزار پر جہاں بھی کوئی سڑی، سودائی، پاگل، ننگ دھڑنگ واہی تباہی بکتا نظر آجائے تو ہم میں سے اکثر یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ہے اللہ والا۔ اس کی بولی ہے خدا کی بولی۔ ہم اپنے فائدے کے لئے ان مغوات کے معنی اور مقصود ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ معنی بتانے والے بھی سٹہ بازی کے دلالوں کی مانند ہماری اس کمزوری کو جانتے ہیں لہٰذا ہم کو بے وقوف بناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اِس مجذوب نے تم کو جو گالی دی ہے گالی نہیں بشارت ہے گھی کی نالی ہے۔ تمہیں گھی کا بلنگیا "تاجر بنا ڈالے گی۔ یہ مست الست اگر تم کو جوتی دکھائے تو جوتی نہیں اپنی دستار کا گنبد سمجھو۔ اور یقین کرو کہ تم کو بہت بڑا مرتبہ ملنے والا ہے۔

یعنی غالب اگرچہ مجذوب نہیں اور نہ اس کے اشعار بے معنی ہیں لیکن ناقد
سٹہ بازی کے انہی ایجنٹوں نے ڈھونگ سے غالب کے بے شمار اشعار کی شرحیں
پیش کر دی ہیں۔ حکم لگا دیئے گئے ہیں کہ جو کوئی ہماری شرح کو تسلیم نہ کرے۔
اے عوام الناس۔ اے شعر کے نہ سمجھنے والو، ہو حق کرنے والو یہ گستاخ ہمارے
خدائے سخن غالب کو نہیں مانتا۔ کافر ہے۔ اور کچھ نہ ہو سکے تو اس کا گھیراؤ کر ڈالو۔

غالبیت کی طوفانی تحریک اور تبلیغ اگر یہ چاہتی ہے کہ فارسی اصطلاحات
کے نیچے دبے ہوئے شعر لوگوں کے ذہنوں میں سما کر زبانوں پر آجائیں تو یہ ناممکن
ہے۔ غالب کی اردو غزلوں کے وہی شعر اہلِ ذوق کو یاد رہیں گے جو غالب کی حیات
سے آج تک سو برس کے دوران قلوب و زبان نے قبول کر لئے ہیں۔ تمہاری
شرحیں دیکھ کر غالب "شعرم را بہ مدرسہ کہ بُرد" ہی کہے گا۔

اس وقت "نقوش" کا نو دریافت بیاضِ غالب، بخطِ غالب میرے سامنے
ہے۔ یہ طفیل صاحب کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہے۔ کوئی شاعر ایسا شعر
کہنا نہیں چاہتا جس کے معانی میں گنجلک ہو۔ یقیناً غالب کے فارسی زدہ اشعار
کے معانی موجود ہیں لیکن ایک شعر کے ایک معنی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے چند اشعار
میں کچھ نہ کچھ فی البطنِ غالب رہ گیا ہو۔

شارحین نے جو بولیاں بولی ہیں ان کی رُو سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب
اپنی غزل کے ہر شعر کو مداری کی پٹاری بنا گیا ہے کہ اس میں سے تماشائیوں کے
لئے جو چاہو نکال کر "واہ رے مداری" کا شور بٹور لیا جائے۔ یا اُس نے
جان بوجھ کر بے شمار ایسے شعر کہہ ڈالے تھے کہ لوگ تاقیامت بھول بھلیاں

میں رہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے نسخۂ حمیدیہ کا اعلان کرتے ہوئے صدا لگائی تھی کہ ہندوستان میں دو ہی آسمانی کتابیں ہیں

"ویدِ مقدس" اور (یہ نسخۂ حمیدیہ) "دیوانِ غالبؔ"

واہ واہ وید مقدس اُس خدا کی نازل کردہ ایسی کتاب ہے جس کی بولی تیس کروڑ ہندو دیوتا بھی نہ سمجھے اور ویدوں کے مقابل شاستروں میں پرشید ہی کے منکر ہو گئے۔

اگر دیوانِ غالبؔ بھی ایسی ہی الہامی بولی میں نازل ہوا ہے تو کیا ہم اُردو دیوان میں درج شدہ تمام اشعار کو واقعی ناقابلِ فہم دیوتائی یا خدائی کلام مان کر خاموش ہو جائیں کہ بھائی اُو ڈنڈوت کرو۔ ورنہ ناستک قرار دیئے جاؤ گے، چنڈال کہلاؤ گے۔

طفیلؔ صاحب مُصر ہیں کہ جو کچھ بھی لکھا جا چکا ہے، اُن کے حوالے کر دوں۔ نظرِ ثانی بھی نہ کروں، کیونکہ فقط اِنہی "ارشادات" کی کتابت باقی ہے۔ لہٰذا اگر کتابت کے دوران طبع متوجہ ہوئی یا ایک آدھ صفحہ میرے نصیب کا رہ گیا تو عرض کروں گا کہ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو اس دَور میں تحریک و تبلیغ کے زور شور سے منوانے کی ضرورت کس کو پڑ گئی ہے۔؟

ہاں تو ذکر تھا بیاضِ غالبؔ کا جو بخطِ غالبؔ ہے۔ مَیں نے کہا تھا کہ یہ طفیلؔ کا مجھ پر احسان ہے۔ احسان یہ ہے کہ مَیں نے اپنی عمر کے گیارہ سے بائیس سال تک کی غزلوں کے بیاض کو محاسبے اور جائزے کے لئے زیرِ مطالعہ کیا۔ تو مجھے

خوشی ہوئی کہ فارسی کی تلمیحات اور لوازماتِ شعری کو جانتے ہوئے میری ابتدائی مشق کا ایک شعر بھی ان کی نمائش کا مظہر نہیں۔ نیز یہ کہ میری ان غزلوں میں جن کو میں نے شائع بھی نہیں کیا۔ کوئی شعر غالبؔ کے اس بیاض کی غزلوں سے کسی صورت میں بھی فروتر نہیں۔ بلکہ میں علانیہ اور بے باکانہ کہتا ہوں کہ میری ابتدائی مشق غالبؔ سے بدرجہا بہتر ہے، کوئی شعر تلازمات کی گٹھڑی نہیں۔ نہ مُغلق ہے نہ مہمل — غالبؔ کے اس بیاض میں غالبؔ کی ابتدائی اردو کی مشقِ غزل ہے مگر ایک شعر بھی اردو زبان کا نہیں ہے۔ فقط کا، کے، کی، ہاں؛ ہوں اُردو ہے۔

اب مجھے واشگاف کہنا ہے کہ غالبیات کی یہ شدید تحریک و تبلیغ غالبؔ کی سخنوری کے لئے ہرگز نہیں۔ موجودہ تحریک بھارت نے اقبالؔ کو آنکھوں سے پنہاں کرنے کے لئے انتہائی مکّاری سے شروع کی۔ فرمایا ہمارا سب سے بڑا شاعر۔ دُوستی کا یار غالبؔ ہے شاعر ایسا ہی ہوتا ہے۔ غالبؔ مسلمان شاعر ہے لیکن وہ سکون اور نیند بخشتا ہے۔ شانتی دیوی کو سامنے لاتا ہے۔ آؤ اس غالب کی بھگتی کریں — اس لئے کہ اقبالؔ زندگی کے لئے مجاہدانہ عمل کی روح کو بیدار کرنے والا ہے۔ اُس نے مردہ مسلمانوں کو زندگی دی اور زندگی ہی نہیں زندگی کا نتیجہ بھی دکھا دیا، اور یہ نتیجہ پاکستان ہے' جو بھارت کے سینے پر کابوس کی طرح سوار ہے۔ لیکن یہ تحریک اس رنگ سے شروع کی گئی کہ ہم سمجھے غالبؔ ہمارا بھی تو ہے۔ بن گئے ہم نچہ جمورا — ساتھ ہی

غالب
کئی جتھے جو ہمارے ملک میں بھی وحدتِ خیال و عمل کی بجائے طبقاتی تفرقے بازی کر رہے ہیں، وہ بھارت کی ڈگڈگی پر ناچنے لگے ۔ کیوں ۔ اس لئے کہ اقبالؔ کہتا ہے ؎

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اور یہ تفرقہ باز جتھے محض درِ مصطفےٰؐ سے منہ پھیر کر چاروں کھونٹ دبیتھار دروازوں پر سجدہ ریزی کرنے اور بھیک مانگنے کے متنادہیں ۔۔۔ کاش آپ غور فرمائیں۔

تخلیق اور شہرت

ہمارا، آپ کا، میرا اور سب مومن مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ اور کلام اللہ باقی ہے اس کے علاوہ سب کچھ فانی۔ البتہ خالق نے اپنی مخلوق عموماً اور انسان کی سرشت میں بالخصوص بعض ایسے جوہر ودیعت فرما دیئے ہیں جن سے بعض ایسے آثار ظہور میں آتے ہیں جو انسان کی موت کے ساتھ سب کے سب ہی مر نہیں جاتے اور شاید اشرف المخلوق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ انسان اپنے وجود سے زیادہ پائیدار یادگاریں اپنے ابنائے جنس کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ ایسے نقوش قائم کر جاتا ہے جو مدتوں قائم رہتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ان کو دیکھتی ہیں۔ ان سے کام لیتی ہیں۔ گزری ہوئی اچھی بُری سیرتوں کا پتہ چلاتی ہیں۔ ان کی کمزوریوں سے عبرت حاصل کرتی ہیں۔ خوبیوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

انسانی زندگی کے یہ نقوش اجسام ہی کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ بعض بچپن ہی میں گزر جاتے ہیں۔ بعض جوان ہوتے ہیں۔ شباب و شیب کی سیر کرتے ہیں اور اپنی زندگی گزار کر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عمر کم ہوتی ہے کسی کی زیادہ۔ بہت سے اپنے خالقوں کی موجودگی ہی میں، یا ان کی رخصت کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔

تخلیق

چند کم یا زیادہ عرصہ تک زندہ رہتے ہیں۔ مگر ؏

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

یہ تخلیقیں عام طور پر تعمیرات، مصوری، موسیقی، انشاء پردازی اور شاعری پر مشتمل ہیں۔ شاعری کے متعلق میرا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ چونکہ اس کی تخلیق شخصیت زندگی، ذہن اور حس کے امتزاج سے ہوتی ہے اس لئے یہ سانس لیتی ہے، چلتی پھرتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، ماحول کو متاثر بھی کرتی ہے اور ماحول سے متاثر بھی ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شاعر صفحۂ فضا پر اپنی نوا تحریر فرما کر گوشۂ قبر میں جا سوتا ہے لیکن اس کی روح سے گونجا ہوا نغمہ اس کی حس اس کی شخصیت اس کے ذہن کی آئینہ داری کرنے کے لئے ایک عرصہ قائم رہتا ہے۔ یہ نغمہ شاعر کے اطوار و عادات پر روشنی ڈالتا ہے اس کے ماحول کی تہذیب، اس کے عہد کے تمدن و معاشرت کے نقشے پیش کرتا ہے۔ شاعر کے ابنائے جنس نسلاً بعد نسل اس کے رنج سے رنجیدہ اس کی مسرتوں سے مسرور ہوتے ہیں، اس سے درس لیتے ہیں، عبرت حاصل کرتے ہیں۔

شاعری کی قبولیت بھی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ مر مر کر زندہ ہوتی ہے۔ زندہ ہو ہو کر مرتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کل جسے زندگی میں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، آج وہی پجنے لگتا ہے اور کل جس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے آج اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ابنائے زمانہ کس کو کس وقت زندہ در گور کر دیں گے اور کس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر سر پر رکھ لیں گے آنکھوں سے لگائیں گے۔

میرے مطالعے میں یہ بھی آیا ہے کہ اندھا شاعر ہومر جب دُنیا میں جسمانی طور پر موجود تھا تو اس کے اشعار سُن کر کوئی بھیک بھی مشکل سے دیتا تھا، لیکن ایک زمانہ آیا جب یونان کے وہی سات شہر جن کے گلی کوچوں میں وہ دربدر، خاک بسر لاٹھی ٹیکتا بھیک مانگتا پھرا کرتا تھا، اس کی جائے ولادت ہونے پر فخر کرنے کو ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ ان میں سے ہر ایک شہر اس امر کا دعویدار بن کر پکار اٹھا کہ رزمیہ شاعری کا یہ عظیم الشان دیوتا میری ہی خاکِ پاک سے نسبت رکھتا ہے۔

شکسپیؔر اور غالبؔ کی مثالیں ہمیں کیا بتاتی ہیں۔ یہی ناکہ معاصرین کی رائے آخری اور قطعی فیصلہ نہیں ہے۔ اور کہ شعر کی اصلی قدر و قیمت پرکھنے کے لئے کوئی ایک معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ ہمعصروں نے اماؔمی کو سب سے بڑا شاعر مانا اور بیچارا سعدؔی کو بمشکل تیسرا درجہ دیا۔ —— لیکن وقت نے اماؔمی کو بھلا دیا، اور سعدؔی کا نام اور کلام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اسی طرح ایسے بھی تھے جن کو ہمعصروں نے انتہائی عزت و احترام کا مستحق گردانا ان پر انعام و اکرام کی بارشیں کیں۔ ان کے جلوس نکالے گئے لیکن ان کا نام ہے اور مضحکہ۔ کلام ہے اور طاقِ نسیاں۔

قبولیت خداداد ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ شاعر کے دوست اسے قبولِ عام کا تاج پہنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ ڈھول پیٹ پیٹ کر اس کو مشتہر کرتے ہیں لیکن زمانہ توجہ نہیں دیتا یا توجہ دینا نہیں چاہتا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمعصر مخالفت میں زمین و آسمان تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ بادلوں کی طرح اُفق پر چھا جاتے

ہیں. لیکن آفتاب چمکتا ہے. یعنی اس کو ہمیشہ کے لئے تاریک بادل چھپا نہیں سکتے۔

ہم قبولیت کے پیدا ہونے کا وقت متعین نہیں کر سکتے اور نہ اس کے پھیلنے بڑھنے اور گھٹنے سمٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہیں. حافظ شیرازی کی قبولیت اس کی زندگی سے اس وقت تک بدستور قائم ہے اور نہ جانے کب تک قائم رہے گی. ؟ — "شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن" کہہ کر غالب نے ایک ستارہ شناس کی طرح حکم لگا دیا اور اس کی بات ایک حد تک درست نکلی لیکن اس شہرت کی میعاد کیا ہے غالباً غالبؔ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اور نہ ہمارے پاس ہے. خاقانیِ شعر میں کوئی کیا جانے کہ غالب سے پہلے کتنے یہی دعوے کر چکے ہیں اور کتنے اور کریں گے لیکن ہر تیر نشانے پر نہیں پہنچا.

ایک دوست کا قول ہے کہ وقت بہت طول طویل ہے اور لامتناہی۔ تہذیبیں اور قومیں فنا ہو جاتی ہیں. ان کے نقوش مٹ جاتے ہیں. گذر جانے والے ہزاروں سالوں کی شہرتیں پرانی شہرتوں ہی کی مدفنوں پر تعمیر ہوتی ہیں۔

گذرے ہوئے زمانوں میں علم اور تحقیق وادب کا کتنا بڑا خزانہ تھا، جو فنا ہو چکا ہے آج جس کا تذکرہ تک نہیں. بتاؤ وہ انبار در انبار کہاں کہاں پڑا ہے. کس کا حوصلہ ہے کہ اس کو چھانٹے اور بہترین چیزیں نکالے. محقق کی کوشش اس غواص کی سی ہے جو سمندر کی تہہ ٹٹولتا ہے اور مٹھی بھر کر باہر نکل آتا ہے. اکثر اوقات اس کی مٹھی سنگریزوں سے بھری ہوتی ہے. کبھی کبھار موتی بھی مل جاتا ہے لیکن کیا وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سمندر کا بہترین موتی یہی ہے ؟ جوہریوں کی دکانوں پر جاؤ، بادشاہوں کے خزانے دیکھو جہاں ڈھیروں موتی پڑے ہیں، پوچھو، کیا سمندر کے اچھے

تخلیق

اچھے موتی سب دستیاب ہو چکے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ سمندر کی تہ موتیوں سے پٹی پڑی ہے جو اتفاقاً تہ سے اُبھر آیا! یا ابھارا گیا وہی نام آور بن گیا اور کسی کام آ گیا۔ لیکن جو ابھی تہ میں ہیں اُن کا شمار خدائے قادر ہی کو ہے۔ ان میں کون کب باہر آئے گا اور کتنے بڑے تاج کی زینت بنے گا۔ کون جانے —! موتیوں کے پرکھنے کے لئے جوہری ہیں۔ موتی اپنے اپنے وزن جسامت اور آب و تاب کے لحاظ سے قیمت پاتے ہیں۔ حسینوں کے گلے کا ہار ہونا یقیناً بہت بڑی خوش نصیبی ہے، لیکن کھرل میں پس کر کسی مریض کی صحت کا باعث بن جانا بھی بدنصیبی نہیں۔ اشعار کو پرکھنے کے لئے نقاد ہیں جو شعر و سخن کے انبار کو اُلٹتے پلٹتے ہیں؛ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قدر و قیمت کا فیصلہ کرتے ہیں — غلط بھی، صحیح بھی۔

یہ انتخاب ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا۔ ہر زمانہ اپنا اپنا معیار خود وضع کرتا ہے۔ گزشتہ زمانوں میں یہی ہوا آئندہ بھی یہی ہوگا۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا۔ مَیں نے قلم برداشتہ عرض کر دیا ہے۔ اپنے بارے میں مجھے اپنا ہی ایک پرانا شعر کفتی ہے۔

نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے، تو اپنی دھن میں گاتا جا!

(برائے صحیفہ تخلیق ماہانہ)

ملی کردار پر ہماری شاعری کا اثر

میری زندگی کے اس دور میں لاہور کے احباب سے گفت و شنید کی جو عزت کسی نہ کسی بہانے مجھے ملتی رہتی ہے، میں آپ سب سے محبت کرنے والا اس کے سوا اور کیا کہوں گا کہ دوستو! اسے جاری رکھو کہ یہی صدقۂ جاریہ ہے۔ ؎

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اس مرتبہ میں، ہمدرد کے فردِ وحید حکیم سعید اور ان کی فوجِ شفا موج، کا شکرگزار ہوں۔ مجھے یہ دعوت ایک پیام رساں کی زبانی پنڈی میں ملی۔ تو میں نے اس انتخاب پر تعجب کیا تھا۔ کیونکہ یہ دعوت جسٹس رحمان مدظلہ العالی کے ساتھ شام منانے کے بعد لا اینڈ آرڈر کی آنکھوں کے عین سامنے مرتبہ و منصب کے قانون کی علانیہ خلاف ورزی ہے۔ حفیظ نہ قانون داں ہے نہ قانون گو، محض اُردو زبان کا پنجابی شاعر ہے۔ حفیظ نے پکڑے جانے کے قابل کوئی حرکت اُردو زبان کے معاملے میں بھی تو کبھی نہیں کی۔ لہٰذا یہ خیال آیا کہ یہ تو ہمدرد

کی تشخیص و تفتیش ہے جو حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ڈرنے کی فی الحال کوئی وجہ نہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے زبانی سمن وصول ہوتے وقت شاعروں کی روایتی رسم کے مطابق لیت و لعل کی ادائیں نہیں دکھائیں۔ یہ دعوت حجت کے بغیر قبول کر لی تھی۔ آپ سب شاہدانِ عادل ہیں۔ دیکھ لیجئے لاہور ہی کے اندر حاضر ہوں، صیغۂ غائب نہیں بن گیا۔

لاہور میرے لئے کیا ہے؟ شاید آج آپ اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ جس طرح خود لاہور میں رہنے پر مجبور ہیں۔ وہی طرزِ مجبوری مجھے لاہور سے دُور رکھتی چلی جا رہی ہے۔ میری جوانی اور ادھیڑپن کے لاہور کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بات کیا تھی؟ ایک قلبی واردات کا معاملہ ہے! ورنہ بظاہر تو:

وہی لاہور ہے، وہی در و بام — وہی ہنگامۂ خواص و عوام
زلزلے، آگ، آندھیاں، سیلاب — لائے تشریف چل دیئے ناکام
پھر ذرا سی شکست و ریخت کے بعد — چل رہا ہے وہی قدیم نظام
ہاں ہماری ترقیٔ معکوس — ہو گئی ہے بہت ہی تیز خرام
خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں! — دیر پا بنتے رہتے ہیں اَسقام
گھٹ رہی ہے تسلیٔ محکوم — بڑھ رہی ہے تعلیٔ حکام
فرش کو عرش کی نہیں پروا — پستیاں ہیں بہت بلند مقام

دیکھئے میں نثر سے نظم کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ نظم میرے لئے آسان ہے،

نثر مشکل! شاعر لوگ تن آسان ہوتے ہیں۔ اس لئے پراگندہ مقالی کا قدم بھی ضبط کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ معافی چاہتا ہوں، اشارۃً اعتراف کئے لیتا ہوں کہ اردو "شعربازی" کے جرم میں جالندھر سے نکال دیئے جانے کے بعد لاہور بھی میری شعرسازی کی جولانی کا مرکز بنا رہا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں چندہ جمع کراتے ہوئے میں نے ایک ٹیپ کے بند میں لاہور کے نقطے پر اپنی گردشِ پرکار کا اعتراف کیا تھا۔ یعنی جالندھری کہلائے جانے کے باوجود لاہوری ہو جانے کے بارے میں ایک شعر بھی تو کہا تھا: ؎

جانے اس خطۂ لاہور میں کیا خوبی ہے
میری کشتی بھی تو راوی ہی میں آ ڈوبی ہے

لیکن راوی نے ابھی مجھے مزید مہلت دے رکھی ہے اب واقعی جالندھری مہاجر ہونے کے بعد لاہور سے ایک مسلسل رواں دواں ہجرت ہے۔ لہٰذا آج کی دعوت قبول کرنے سے گریز اور شاعرانہ طرز کے لیت و لعل کرنے میں خطرہ تھا کہ مبادا شام جو آپ، سخن فہم، سخن سنج دوستوں سے ملنے کا پیغام ہے، کسی اور مقام کی طرف ہجرت کر جائے۔ میرے لئے لاہور کے احباب سے ملاقات ؏

یعنی کچھ بات ہی ایسی تھی کہ جھٹ مان گیا میں

مگر زبانی دعوت قبول کرتے وقت مطمئن تھا کہ میری یہ شام چند احباب اور قدردانانِ زبان و بیان کو فقط شعر سنانے تک ہی محدود رہے گی۔ آپ کو بدستور محض شعر سے بہلاؤں گا اور یاد اللہ کہہ جاؤں گا۔ راولپنڈی پلٹ کر اتراؤں گا کر

ایک اور "کارے کردہ ام"

کوئی کچھ کہے، لاہور دوسرے مقامات کی نسبت آج بھی "کچھ اور" ہے۔
چند پرانے اور چند در چند پرانے دوستوں کی جھلک لئے ہوئے نئے دوست مل
ہی جاتے ہیں اور میں دل ہی دل میں کہہ اٹھتا ہوں کہ اللہ اگر مے کدۂ ہستی میں
پھر ایک بار ؎

پرانا دور ہو جائے تو کیا ہو!
وہی لاہور ہو جائے تو کیا ہو!

اپنی روش پر راہ چلتا آپ لوگوں سے مل لیتا ہوں۔ آپ کے دلوں کا حال
آپ جانیں، البتہ میں شکوہ سنج ہوں کہ ؎

ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں ملاقاتوں کے بعد اکثر
وہ ہم کو بھول جاتے ہیں ہم ان کو یاد کرتے ہیں

خدارا مان "سکئے" تو مان لیجئے کہ متواتر ایک "آہ سرد ایک اشک گرم" یہ ہے
لاہور سے باہر میری زندگی۔! معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میری صبح سے آنکھیں
بند کر چکا ہے۔ اب یہاں میری "شامیں" منائی جا رہی ہیں۔ حالانکہ میری شب
حیات کی بھی صبح نمودار ہے۔

میری شاعری جلسوں، جلوسوں، مجلسوں اور مشاعروں سے گزری ہے اب
جب کہ وقتِ غروب قریب ہے۔ آج کی شام آپ کے حضور حاضر ہو جانے کے
سلسلے میں مجھے ہمدرد سے اس حکمت کا گمان نہ تھا کہ شعر کے علاوہ بھی مجھے کچھ
عرض کرنا ہوگا۔ شاید ساٹھ اور تین تریسٹھ برس کا نظر آنے کے باوجود اطبائے دہلی

نے میرے نعرے کے

"ابھی تو میں جوان ہوں"

کی سُن گُن پالی ہے، اور خدمتِ خلق کی دُھن میں مجھ سے بھری محفل کے اندر وہ نُسخہ اگلوا لینا لازم جانا ہے جس نے میرے جسم کو نحیف اور میری رُوح کو اب تک جوان رکھا ہے۔ ساتھ ہی مجھے بھی یہ لالچ تھا کہ "ذہنی جوانی" کی ہانک لگاتے چلے جانے کی وجہ سے جسمانی کھینچا تانی جو میرے نصیب میں ہے اسے قائم و دائم رکھنے کا نسخہ بھی ہمدرد کے فہیم حکیم سعید سے معلوم کرلوں گا۔ اگر لاہور آکر بھی دہلی والے میرے دردمند بن جائیں تو شاید بہت سے مفرحات اُردو شعر کے عوض مفت داشتن ہوجایا کریں گے۔ اسی طرح جیسے دہلی میں رُونما ہوتے ہی مرحوم حکیم محمد احمد خاں اور حکیم بھُورے میاں (مرحوم) مجھے تفریح کے طور پر مفرحات سے نواز دیا کرتے تھے۔ مفرحات تو کیا بھُورے میاں کے ہاں سے تو مونگ کی بڑیاں بھی مجھے گھر بیٹھے لاہور میں ان کی حیاتِ دُنیوی تک وصول ہوتی رہیں۔ ؎

سال بھر سہ کے بھوک کی کڑیاں　　مجھ کو ملتی ہیں مونگ کی بڑیاں

آج کے بارے میں کہنا یہ تھا شعر سنانے کے لئے تو میں مستعد ہوگیا تھا کیونکہ اس سے "واہ واہ"، "سبحان اللہ" کسی نہ کسی طرح ہتھیا ہی لیتا، مگر زبانی پیغام کے بعد جب تحریری دعوت نامہ ملا تو اس میں لکھا تھا کہ "ایک گرانقدر مقالے" سے بھی میں آپ کو لطف اندوز کروں گا۔

سچ کہتا ہوں مجھے تو یہ ایک دھمکی سی نظر آئی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ ہم

شاعر لوگوں کا دل ذرا جلد ہی بیٹھ جاتا ہے لیکن ہم تعلّی کے ساتھ ذرا سی تسلّی دے کر اسے پھر اُٹھا دیا کرتے ہیں۔ ہمدرد دواخانے والے لکھ لیں کہ یہ ہے میری جوانی کا راز۔ دیکھئے میں نے نسخہ آپ کو بتا دیا ہے۔ حکیم سعید چین سے واپس تشریف لے آئیں تو ان کی خدمت میں میری طرف سے بطور نذرانہ پیش کریں۔ بس دو مفردات تعلّی اور تسلّی ــــ!

خیر، میں نے اپنے دل کو سنبھالا اور خود بھی یہ سوچ کر سنبھالا لے لیا کہ گھڑ لوں گا کوئی ایسا ویسا افسانہ، افسانہ طرازی تو اب عام ہے۔ ہر اُیرا غیرا افسانہ گھڑ لیتا ہے تو شاعر کے لئے کون سی بڑی بات ہے یا پھر دو چار لطیفوں میں آپکو اُڑا دوں گا۔ کسی ترقی پسند سے اخبار میں بھی لکھوا دونگا کہ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

لیکن مشکل یہ آگئی کہ میری شام منانے والوں کے نام ارسال فرمودہ دعوت ناموں کی ایک نقل بھی اس چِٹھی کے ساتھ ہی چسپاں تھی۔ اس میں آپ کو "مژدہ" سنا دیا گیا تھا کہ حفیظ جس "مقالے" سے آپ کو لطف اندوز کرنے والا ہے اس کا عنوان ہے:

"ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر"

جلّ جَلالہٗ! یہ تو نفسیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اتنا اہم کہ اس پر تبصرہ اس ڈھلتی ہوئی شام کے مقام پر عیشِ دماغی کی تفریحی مجلسوں میں کیسے ممکن ہے؟ اس موضوع پر تو سنجیدگی کے ساتھ بات چیت ہونی چاہیئے۔ سب سے پہلے ہمارے قومی گھرانے کے درمیاں بیوی یعنی "محترم عورت صاحب"

اور "بیگم فکر" صاحبہ تنہائی میں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس کے بعد ان کے پڑوسی
قلب و نظر ایک جگہ جمع ہوں اور غور و فکر کی اُلجھنیں سلجھائیں تاکہ قوم کے
فرزندوں اور دُختروں کے کردار پر جو اثر ہماری شاعری کا موجود ہے
یا جو آئندہ مطلوب ہے اس کا فیصلہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ فرزندان و دختران
ہی تو اُب قوم ہیں کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہماری شاعری ان پر کس
طرح اثر انداز ہے۔ کیا موجودہ کردار سے آپ کا پیٹ نہیں بھر گیا۔

آپ میرا مقالہ سننے کے لئے تشریف لائے ہیں تو لیجئے سنئے۔ میں نے
ہر محفل میں آپ کو شعر ہی سنائے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے اشعار میں مُبالغہ آرائی
سے پرہیز ہی کرتا رہا ہوں، کیونکہ میں اس کا اہل نہیں لیکن شاعرانہ "جھوٹ
مُوٹ" اور "سچ مچ" دونوں کے زیر اثر آپ شاعروں کو اگر دیوانہ نہیں تو
فرزانہ بھی نہیں جانتے، تاہم مجھ پر کرم فرمایئے اور میری شاعرانہ زندگی میں
پہلی مرتبہ مجھ سے ایک عقل کی بات نثر کے لہجہ ہی میں سُن لیجئے۔ بات کوئی اتنی
تلخ نہیں کہ آپ کو ناگوار گزرے۔ یہ عقل کی بات محض اتنی سی ہے کہ میں تو
محض شاعر ہوں اور اردو کا اہلِ زبان بھی نہیں۔ قومی کردار پر ہماری شاعری کے
اثر کے پیچیدہ معاشرتی یا اخلاقی مسئلے کو مجھ ایسے شاعر سے طلب ہی نہ کریں تو
بہتر ہے۔ ہماری شاعری تو ابھی تک زلفِ یار میں اُلجھی ہوئی ہے وہ قومی کردار
کے مسائل کو اور بھی اُلجھائے گی۔ میں شاعری اور اس کے تاثر کا نقاد کیسے ہو
سکتا ہوں۔ میں نے فرائڈ اور ژونگ وغیرہ کی "اینٹ الجر" کتابیں رٹ
کر نقادی کا ڈنکا بھی نہیں بجایا۔ دوسروں کا نام لے کر اپنی اُستادی کا سکہ

جی نہیں جناب! اس قسم کی حرکات، کو نقّاد لوگ فلسفہ کہتے ہیں۔ میں فلسفی نہیں، شاعر جیسا کچھ بھی ہیں ہوں۔ ایک نظم میں (جو دوران سیاحت انڈیا میں سرزد ہوئی تھی) فرانس اور ڈونگ والوں کو میں نے بھری محفل میں بتادیا تھا کہ

شاعر ہوں، مرا کام نہیں فلسفہ رانی کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی
انسان کی تصویر نئی ہو کہ پرانی مطلوب مجھے حسن ہے اور حسن معانی

اللہ کے بندوں سے مجھے بیر نہیں ہے
یعنی مری دنیا میں، کوئی غیر نہیں ہے

اب آپ ہی فرمائیے کہ شعر و شاعری کا اثر قوم اور قومی کردار پر دکھانے کے لئے ایک مقالہ آپ کے گوش گزار کرنے کی جسارت فرما کر اپنے "نقاد استادوں" سے مفت کا بیر کیوں خرید لوں؟ توبہ توبہ! اللہ۔ نقادانِ فنِ شعر و ادب سے ہر شاعر کو اس کی زندگی میں تو محفوظ ہی رکھے۔ (آمین ثم آمین)

ہماری شاعری کے قومی اور اخلاقی اقدار ہی کا معاملہ تو تھا کہ اکبر الہ آبادی اپنے وقت کے استاد نقادوں کی خدمت میں یہ شعر عرض کر کے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ ؎

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے۔!

البتہ اوپر جو مسدس کا سادہ سا بند میں نے پیش کیا ہے اس کے پہلے دو مصرعے یعنی ؎

شاعر ہوں مرا کام نہیں فلسفہ رانی
کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی

ہی ہم شاعروں کے مزاج کی افتاد پر دال ہیں۔ شاعری کی بنیاد دراصل اگلے دو مصرعوں پر قائم تھی۔ یعنی "حسنِ صورت" اور "حسنِ معانی" اور یہی مشکل مسئلے ہیں۔ شاعر آسان پسند ہوتے ہیں۔ کردار کی بھونڈی سے بھونڈی صورت اگر کسی شاعر کو پسند آجائے یا کسی گھناؤنی اپج کو سمجھ لے تو اس کا نقیب بن کر اپنی شاعری کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا ہے۔ کیونکہ شاعر کے نزدیک ؎

یہیں ختم ہے بحثِ معیارِ حُسن
جو دل لے گیا دل رُبا ہو گیا

لہٰذا تن درُست و توانا حسن، روح کو جلا دینے والے معانی کی حُسن کاری اور اس کے مقابل گھناؤنی اور سڑاندھ سے بھرپور تبلیغ بدکرداری دونوں ہماری قوم پر اثر انداز نظر آتی ہیں۔ سڑاندھ زیادہ ہے یا خوشبو؟ اس کا اندازہ آپ اس ٹیجل سے کر سکتے ہیں۔ جو ہر گلی کوچے میں خراماں خراماں قوم کی لذت یا ذلت کا سامان پیدا اور ہویدا کرتی چلی جاتی ہے۔

اگر یہی بنیاد ایک مدت سے ہماری شعر و شاعری رکھتی ہے اور ہمارے شعرائے باکمال بھی انھی بنیادوں پر اپنے دیوان ہمارے قومی ایوان میں آمد لکھا یا واہ واہ کیے۔ لئے چھوڑ گئے ہوں تو میں ان بزرگوں کی رکھی ہوئی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے تو پیدا ہوا ہی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حالی، اکبر اور اقبال سے متاثر ہو کر میں نے خود بھی کچھ نئی بنیادیں رکھی ہیں۔ ان پر چھوٹی بڑی عمارتیں بھی کھڑی کی ہیں یہ بھی چاہتا ہوں کہ سو دو سو برس کے بعد مجھے بھی، مجھ پر بھی اعتراض کرنے والے بزرگ مان لیں تو کوئی حرج نہیں۔ شاید آنے والے دور میں میاں

ما کردار کا ہماری شاعری پر اثر

غور صاحب اور ڈاکٹر صاحب میرا تذکرہ بھی شاعری کے تاثرات کے بارے میں کیا کریں۔ اس ذکر سے مجھے وہ چیز حاصل ہونے کی توقع ہے جو "روحوں" کو ثواب کے طور پر ہماری قوم پہنچاتی رہتی ہے۔ کیونکہ مجھ ایسے نئی بنیادیں رکھنے والے شاعروں کے ۔

سخن کی قدر دانی زندگانی میں نہیں ہوتی
یہاں جب شمع بجھ لیتی ہے تب پروانہ آتا ہے

آج کے "مقالوی موضوع" کے بارے میں گزارش فقط یہ ہے کہ عربی کا ایک لفظ "شَعر" شین بالفتح لئے ہوئے ہے۔ فتح ہمارے یہاں زبر کو کہتے ہیں۔ شَعر کے معنی ہیں "بال"۔ خدا جانے کیوں شِعر کو (جو شین بالکسر کے ساتھ ش۔ ع۔ ر سے متعلق ہے) "بال" سمجھنے لگے ہیں۔ زبر زیر ہو کر رہ گئی اور شعر بے چارہ "بال" بن کر نقادوں کے ہاتھ آگیا۔

مجھے یاد ہے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا چھٹی جماعت کے مولوی صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ شعر بال کی مانند نفسیاتی باریکیوں کی شال چمکدار اور ملائم ہونا چاہیے۔ اس بے چارے نے شعر کو بال نہیں کہا تھا، لیکن شاید نقادوں کے استادوں نے یہی مفہوم بتا رکھا ہو۔ کیونکہ آج کل کی "کالجی نقادی" بال کی کھال اتارنا ہی استادی اور سخن فہمی اور ادب کا فلسفہ بتاتی ہے اور اب مسلسل بتائے چلی جا رہی ہے کہ بال کی کھال اتارنے کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ بہت گراں قیمت ہوتا ہے۔ نقاد استاد شعر و شاعری کے تاثرات کی پروا نہیں کرتے۔ البتہ انگریزی بولی کھال کی قیمت بڑھا کر موٹی موٹی کتابوں کی کھالیں روز بروز جمع کی

جارہی ہیں. یہی موٹی موٹی کتابیں، جن میں شعر کے منڈے ہوئے سروں کے بال گڈمڈ ہوتے ہیں. انھی کا مطالعہ ادب کی عبادت قرار دیا جاتا ہے. انھیں کتابوں کے رنگ روپ نے مجھے کسی زمانے میں یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ؎

نہ کر طوفاں زدوں کی شاعری پر تبصرہ پیارے
ترے تو پاؤں بھی نکلے نہیں دامانِ ساحل سے

بہرصورت بات مقالے کی ہے. مجھے خطرہ ہے کہ شاید ان ہی تاثرات کے تحت مجھے مدعو کرنے والے محترم ستم ظریفوں نے آج کی شام میرے مقالے کو "گراں قدر" بتایا ہے. بشرطیکہ میں مقالہ لکھ دوں، لکھوں ہی نہیں بلکہ سنا بھی دوں.

"مقالہ پڑھ کر سنا دینا" تو واللہ داد دیتا ہوں. لینے کے دینے پڑ گئے ہیں. وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس وصول شدہ داد کی "کھانچیاں" بھری رکھی ہیں، داد سے تنگ آ کر میں نے یہ شعر بھی تو کہہ دیا تھا کہ ؎

مرے اشعار پر چپ رہنے والے
ترے حصے میں آئی داد میری

الحمدللہ بات چپ رہنے تک پہنچ گئی. تمہید اتنی طولانی رام کہانی ؎

کہیں اکتا نہ جائے دوستوں کی طبع فرزانہ

لیجئے قبول کئے لیتا ہوں کہ نظم چھوڑ کر مجھے نثر کی صورت میں بھی آج کچھ کہنا پڑ گیا ہے تاہم یاد رکھئے گا جن معنوں میں آپ قال کو مقالہ کہتے ہیں، وہ یہ نہیں ہے. یہ تو قالِ حال ہے. اگر اسے مقال گردان لیں تو آپ جانیں.

میں تو یہی کہوں گا کہ یہ حفیظ جالندھری کی گفتگو کا لہجہ ہے۔ حفیظ نے شعر و شاعری تو کی ہے۔ بُری یا بھلی کا فیصلہ مجھ پر واجب نہیں ہے۔ شاید آپ بھی فیصلہ کرنا پسند نہ کریں کیونکہ ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے خود ہی تو کہا ہے

یہ اور دور ہے، اب اور کچھ نہ فرمائے
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے

واللہ آج مجھے افسوس ہے کہ میں نے بال کی کھال کیوں نہیں کھینچی

شعر می گویم بہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

مقالے کی اصطلاح کے بارے میں یہاں اپنی بوریت کے لیے میں کسی کو الزام نہیں دوں گا۔ جز این قدر کہ مقالہ از قسم مقالہ لکھنا کچھ پروفیسروں، عالموں اور فاضلوں ہی کا کام ہے، جس کو جب وہ پڑھ کر سناتے ہیں تو اسی طرز کے پروفیسر، عالم اور فاضل سنتے سمجھتے بھی ہوں گے اور چہ مگوئی بھی فرماتے ہوں گے۔ خدا کی قسم میں نے کبھی بھول کر ایسی حرکت نہیں کی البتہ ان ماہرین کے مقالے ان ہی کی زبانِ مبارک سے سننے کے لئے بلا پہنچ جانے کا الزام مجھ پر دیا جا سکتا ہے۔ مقالہ سننے کی وجہ میرے لئے یہ ہوا کرتی تھی کہ چونکہ میں شاعری کے جنون میں ساتویں جماعت کا امتحان دے کر پاس ہو جانے کے خوف سے اپنا بستہ ایک تالاب میں ڈبو کر بھاگ نکلا تھا۔ نصابوں کی کتابوں سے سر مغزی، خلجان تھی۔ میں نے اسکول سے نکل کر بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ زیادہ تر

کہانیاں، قصے اور داغ و امیر یا ذوق و مومن کے دیوان میرے مطالعے کے حصے میں آئے۔ اور میں نے بھی پہلے پہل غزل ہی کو تختۂ مشق بنایا۔ لیکن شعر و شاعری حالی، اکبر اور اقبال کے سبب قومی زندگی کے لئے اب واہی تباہی بکنے کا معاملہ نہیں رہا تھا۔ اس لئے زبان و بیان ہی نہیں، مقصدِ حیات کے لئے منزل اور اس کی راہ جاننے پہچاننے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ اب میرے سامنے اور میری آماجگاہ ماہرین علم و فن تھے، جو پھولوں اور پھلوں کا رس نچوڑ کر اپنے اندر ذخیرہ کر چکے تھے۔ میں نے سوچا کر ان کی زبان اور ان کے بیان سے ایک آدھ گھونٹ اس رس کا شاید میرے بھی کام آئے۔ یقین فرمایئے اُن دنوں جہاں بھی مجھے پتہ چلتا کہ خاص طور پر شعر و ادب اور مصوری و موسیقی یعنی ہر قسم کے فنونِ لطیفہ پر مقالے کی صورت میں کچھ فرمایا جائے گا اور یہ ارشادات کتابی ماہرین کی تقریر و تحریر کا مجموعہ ہوں گے۔ میں بھی سامعین کے "بیک بنچرز" میں جا بیٹھتا۔ لیکن مجھے بسا اوقات یہ نظر آتا کہ شاعری پر مقالہ وہ عالم لوگ ارشاد فرما رہے ہیں جو نہ تو خود شاعر ہیں اور نہ شعر کو موزوں طریقے سے پڑھ سکتے ہیں۔ مصوری اور موسیقی پر رائے زنی وہ حضرات فرما رہے ہیں جو نہ مصور ہیں نہ موسیقی داں۔ محض "افسانوی رستمانِ زمان" ہیں ؎

علم شے پر ہے جہلِ شے غالب

ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام

میں مدتوں یہ مقالے سنتا اور سر دھنتا رہا ہوں۔ اب بھی موقع ملے تو باز نہیں رہتا۔ یعنی ان مقالوں کی مجلسوں میں اب بھی کبھی کبھار باریابی کا شرف مل ہی

جاتا ہے۔ یہ ماہرین نقد و نظر اپنے مقالے مختلف قماش اور مذاق کے لوگوں کے سامنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ بسا اوقات میں بھی سامعین میں بیٹھا نظر آیا کرتا ہوں۔ ان محفلوں میں میری خاموشی واقعی شاعرانہ ہی ہوتی ہے۔ یہاں بھی ایک شعر ہی سنا دوں تو بہتر ہے کیونکہ یہی موضوع ہے یعنی شعر سے مزہ آجاتا ہے۔ مقالے کا "پایاں"۔ رطبِ شعر کے سبب قدرے قابلِ شنیدن بنا رہتا ہے۔ ایسی محفلوں میں خاموشی کا سبب میں نے اس شعر میں کہہ رکھا ہے ؎

مجلسِ وعظ میں خاموش جو دیکھا مجھ کو
چل دیا اٹھ کے مری بات سمجھنے والا

مقالہ خوانی کی محفلوں میں اپنی قومی افتادِ طبع جو میں نے دیکھی ہے مجھے افسوس ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ میرا تجربہ کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ مختصر یہ کہ واقعی مقالے سے میں کچھ سیکھنے جاتا ہوں۔ مگر میری اپنی بے مائگی الحمدللہ برقرار ہے۔ وہاں اکثر نظر آتا ہے کہ مقالہ سننے والے چند افراد ہی اصل معنوں میں کچھ جاننے کے شوقین ہوتے ہیں۔ باقی بلائے ہوئے بھولے بھالے رونقِ محفل کے طور پر سامعین با تمکین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مشاعروں کی نسبت یہاں قلیل التعداد مجمع مقالہ خوانی کے ساتھ کوئی اور پنچ لگانے ہی سے ہوتا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے بہت سے تو اونگھتے پائے جاتے ہیں۔ اکثر جمائیاں لیتے ہیں۔ بعض کھانس کھانس کر فضا کو دق آلود کرتے ہیں۔ اور مقالہ نڈھال ہو کر رہ جاتا ہے

ایسی صورت میں اگر مجھ سے بہتر شاعر موجود ہو تو وہ ورنہ مجبوب بے چارے کو ماخوذ کر لیا جاتا ہے۔ میں تو بھلے مانسوں کی طرح مقالہ سننے اور اس میں سے بن بندھے موتی چننے حاضر ہوا تھا۔ میری کمزوری یہ بھی تھی کہ دوسروں کی طرح مجلس سے کھسک بھی نہیں سکتا تھا لہٰذا مجھے یا کسی اور شاعر، موجودگی کا الزام جبر کر پکڑ لیا جاتا ہے اور کسی صاحب کی مقالہ خوانی کے دوران ہی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ حضرت گھبرائیے نہیں۔ ذرا دہ حرکت جس کا نام "انتظار" ہے، فرمایئے۔ دیکھئے فلاں صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ کوئی اور نہیں، تو حسنِ اتفاق سے شاعرِ اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی موجود ہیں۔ مقالے کے ختم ہونے پر وہ بھی اپنے کلام سے نوازیں گے۔ یہ سن کر میں تو دل ہی دل میں شہنشاہ ظفرؔ دہلوی کا شعر پڑھنے لگتا ہوں ؎

ہم سے چوری کوئے زلفِ یار میں جاتے تھے یہ
حضرتِ دل اے ظفرؔ اچھا ہوا پکڑے گئے

ادھر انتظار کی یہ گت ہوتی ہے کہ شعر شاعری کے لئے گرم جوش ہو کر متوجہ ہو جانے والوں کے سامنے کان دبائے یہ "انتظار" غراتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ اب صدرِ مجلس مقالے والے کے کان میں کچھ پھونک دیتے ہیں۔ مقالے کو مقطع پر لایا جاتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں۔ مجھ سے بہتر شاعر ہو تو وہ طمطراق سے ورنہ چار و ناچار میں اٹھتا ہوں اور یادداشت کی گٹھڑی سے جو کچھ ہاتھ آئے، مقالوں کے بیچ کھیت شعر کی بھادوں برسانا شروع کر دیتا ہوں۔ بارہا تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ یہ مقالہ خوانی لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ تھا۔ دراصل یہ بزم

آرائی مجرد شاعری کی پذیرائی کے لئے تھی۔

آج کے موضوع کو اگر آپ بھول نہیں گئے تو ملاحظہ فرمائیے کہ مقالے کی مجلس میں شعر شاعری شروع ہوتے ہی اونگھنے والے بھی جاگ اٹھتے ہیں، جمائیاں بھی ہوا ہو جاتی ہیں اور وہ طالبانِ علم و فن جو کھانستے ہوئے مقالہ خوانی کے اثر سے دِق کے عارضے میں مبتلا ہونے کا بہانہ کر رہے تھے۔ نعرہ عاشقانہ لگانے لگتے ہیں۔ بلکہ وہ مقالہ فہم جو چپکے سے مجلس سے باہر نکل گئے تھے اور دوسروں کو بھی باہر آنے کے لئے اشاروں اشاروں سے ورغلا رہے تھے۔ وہ سب بھیڑ بھڑ کا بن کر پلٹ آتے ہیں اور شاعر پر واہ واہ یا آہ آہ کے اولے برسنے لگتے ہیں۔ یہ کیا صورتِ حال ہے؟ مقالے کے میدان میں شاعری کا چوگان۔ آخر یہ کیا بات ہے؟ ع

بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں

مقالہ علمی معاملہ ہے لیکن شاعروں نے واہ واہ اور آہ آہ کی ایک ایسی فضا مدتوں سے قوم کے پڑھے لکھے ذہنوں کے لئے بھی قائم کر رکھی ہے۔ کہ کسی سنجیدہ اور علمی موضوع پر کان دھرنا گویا جیتے جی مرنا بن چکا ہے۔ چونکہ مقالے پر واہ واہ کا دستور نہیں ہے۔ سامعین کو چپ سادھنا پڑتی ہے۔ چپ رہنا حیوانِ ناطق کے شرف کو ضائع کرنے کی بات ہے۔ اس لئے اب جو شاعری شروع ہو گئی تو گویا چپ چاند سے چھٹی مل گئی۔ اب قوم کے اخلاقی کردار کی اصل صورت آئینہ ہوتی ہے۔ مکرر فرمائیے! سبحان اللہ! کیا مصرعہ کہہ دیا آپ نے آپ ہی کا حصہ ہے! اس طرز کی تحسین سے ایوان گونج اٹھتا ہے۔ شاعر صاحبان

یا میں اِس داد سے جھولیاں بھر لیتے۔ دوسروں کا تذکرہ کیوں کروں، میں خود
- ایک اور ایک اور" کے جوابِ باصواب سے تھک ہار کر آخر کار جھکتا ہوں۔
سلام عرض کرتا ہوں، پھر رفوچکر ہو جاتا ہوں۔ سچ ہی تو کہا ہے ؎

اے حفیظ آہ آہ پر آخر!
کیا کہیں دوست واہ وا کے سوا

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے دوستو! عزیزو! بزرگو! خوردو!
غالباً آپ نے اس اُمید میں سُن لیا ہے کہ یہ شاید زیرِ موضوع مقالہ کی شگفتگی
کے گرم مسالے کی تمہید ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے آج کے موضوع
پر کہنا تھا، کہہ چکا۔ آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ اگر مقالوں کی صورتِ حال یہی ہے تو
خود ہی فرمایئے کہ آپ ابھی اور کیا چاہتے ہیں۔؟

جو بھی میں کہہ چکا ہوں اگر اس میں نصف کے قریب بھی مبالغۂ شاعرانہ سے
خالی ہے تو ہماری قومی اور اخلاقی زندگی پر ہماری شاعری کا بہت ہی بُرا اور بہت
ہی بڑا اثر پڑا ہے اور یہی اثر ہمارا کردار بنا ہوا ہے۔ ہم کسی سنجیدہ بات پر غور کرنے اور
اور اس کا فیصلہ فرمانے سے عاری ہو چکے ہوتے ہیں۔ کیا میری اس سادہ سی گزارش
نے ہماری شاعری کے اثر کا ایک بہت ہی اہم گوشہ آپ کے سامنے بے نقاب
نہیں کر دیا۔؟

ہم شاعر لوگ۔ ہماری بات صاحبانِ علم و فضل ذرا کم ہی مانا کرتے ہیں۔
خیر مانئے نہ مانئے، میں تو اپنے محدود علم اور غیر محدود یقین کی بنا پر کہتا ہوں
کہ ہماری قوم کے ذہن اور کردار پر ہماری شاعری نے ایک مدت سے جو بکھ

۔ہمارا کھا ہے اس نے کثیر التعداد افراد۔ کروڑوں عوام الناس اور لاکھوں خواص الناس کے لئے سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر سے کام لینے اور کسی قابلِ عمل فیصلے پر پہنچنے کی ذہنی راہیں قطعاً بند کر رکھی ہیں۔ وہ راہیں جن پر چل کر حوصلہ مند قومیں ترقیوں کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں۔ بلندیوں پر چڑھتی ہیں۔ اور سرفراز نظر آتی ہیں۔

شاید حکیم الامۃ علامہ اقبال کی بات میری ہفوات سے زیادہ آپ کے لئے قابلِ قبول ہو۔ فرماتے ہیں ؎

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں
انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

یاد رکھئے کہ علامہ "مذاقِ سخن" کی مذمت نہیں کر رہے ہیں مذاقِ سخن کسی قوم میں نہ ہونا کوئی اچھی بات نہیں لیکن مذاقِ سخن کاہے کے لئے؟ آگے بڑھنے کے لئے یا کسی مقام پر جم کر مٹی کا ڈھیر ہو جانے کے لئے؟

مذاقِ سخن کے بارے میں ہم عام شاعر لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ ؏
انساں نہیں ہے جس کو مذاقِ سخن نہیں

لیکن مذاقِ سخن خوش مذاقی بھی ہو سکتی ہے اور بد مذاقی بھی۔ دونوں اپنا اپنا اثر رکھتی ہیں۔ بد مذاقی بڑھائی جائے تو قوم بد مذاق، یعنی بد اخلاق ہو جائے گی۔ خوش مذاقی خوش کرداری کا نام ہے۔ اس سے کام لیا جائے تو قوم اپنے کردار کی خوبیوں سے شہرۂ آفاق بن جائے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کا مقصود ان قوموں کی "بے مذاقی" ہے جو محض مادّی

ترقی کے درپے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ قومیں جو کچھ کام کرتی نظر آرہی ہیں اور پاکیزہ مذاق نہیں رکھتیں، ان کا کردار نوعِ انسان کی تباہی کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے یہاں سب لوگ، جس کو مذاقِ سخن سمجھتے ہیں اور جس سے ہمارے بہت سے شاعر کام لے چکے ہیں اور لے رہے ہیں اسی ناقابلِ رشک، اور بے پناہ مذاقِ سخن نے قوم کے ملی مقاصد سے روگردانی کر رکھی ہے۔ اگر شاعر لوگ اپنے مذاقِ سخن کے حسن و قبح کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملت سے وابستگی قائم رکھتے تو ہماری قوم اس سے بہت فائدہ اٹھاتی، اپنے قدم ترقی دارین کی راہوں پر آگے بڑھاتی۔ عین اسی طرح جیسے عربوں نے مذاقِ سخن کے ساتھ ساتھ ساری دنیائے انسانیت کی بھلائی ملحوظ رکھی تھی۔ اور وہ کارنامے کر دکھائے تھے جن کے لئے ہم ترس رہے ہیں۔

اب بھی اگر ہم شاعر لوگ سیدھی راہ پر آجائیں تو شاید بگڑی ہوئی سنور جائے اس سے آگے کچھ اور کہنا اپنے شاعر بھائیوں کی طرف سے ملامت کا ہدف بننے کا سامان ہوگا۔ میرا ایمان یہ ہے کہ انسان کے وجود کے اندر خیال اور احساس کی صورت میں جو کچھ رکھ دیا گیا ہے اس کے غلط استعمال سے شر اور صحیح استعمال سے خیر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کیا آپ سب اس بات کو نہیں جانتے کہ شاعر جذباتی ہوتا ہے اور شاعری جذبات ہی کے اظہار کا نام ہے۔ ؟ جذبات کیا ہیں ؟ انسانی مشین کے اندر پیدا ہونے والی توانائی۔ اس کو خواہشات کی "بھاپ" بھی کہہ سکتے ہیں یا بجلی کی رَو کہہ لیجئے اور بھی زیادہ ترقی پسندی منظور ہو تو ایٹم کی توانائی سے موسوم

فرمائیے۔ بات ایک ہی ہے۔

جذبات کوئی بُری چیز نہیں ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی چیز میرے اللہ نے بُری یا بُرائی کے لئے پیدا نہیں فرمائی۔ جذبات بھاپ ہوں، بجلی ہوں یا ایٹمی توانائی ان سے کوئی مفید کام لینا ہی مقصود ہے۔ کسی مشین کو کسی رُخ پر چلانے کے لئے بھاپ، بجلی یا ایٹمی توانائی سے کام لینے سے پہلے منزلِ مقصود کا تعین اور اس منزل تک پہنچنے کے بعد کے نتائج کو ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اگر تعینِ منزل نہیں تو یہ کلیں یہ مشینیں یہ موٹر کاریں یہ انجن ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور فسادِ عظیم پیدا کریں گے۔

اگر ہماری شاعری جذبات کی زَد سے بھری ہوئی کل ہے، اگر کوئی ایٹم بم ہے تو اسے کہاں، کیوں اور کس طرح استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ جان لینا شاعر کا فرض ہے، ورنہ بقول اکبرؔ ؎

رقیبوں نے بہت غزلیں پڑھیں اور دُر فشانی کی
میں اشک آنکھوں میں بھر لایا۔ بلاغت اسکو کہتے ہیں

اگر بھاپوں، بجلیوں اور توانائیوں کی طاقت سے انسان انسانوں کو تباہ کرنے ہی پر مستعد رہے تو آپ اس بھاپ، اس توانائی، اس بجلی کو تو بُرا نہیں کہہ سکتے۔ آپ ان قوتوں کے بُرے استعمال کو بُرا کہیں گے، وہ استعمال جو کائنات میں شر اور فساد پیدا کرتا ہے لیکن اگر ان ہی خداداد قوتوں کو انسان انسان کی بہتری کے لئے کام میں لائے، جس سے انسانی معاشرے میں طمانیت پیدا ہو جائے تو یہی کارِ خیر ہے۔ اپنے پیدا کردہ شر

ملی کردار کا ہماری شاعری پر اثر

خدا کی عطا فرمودہ نعمت کے غلط استعمال کے نتائج ہیں اور صحیح استعمال سے خیر ہماری تدبیروں کی تقدیر ہیں۔

آپ پوچھتے ہیں کہ ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر کیا ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہمارے قومی معاشرے میں نعرے بازی کے طور پر جو کچھ ہو چکا ہے اور کچھ مدت سے ہو رہا ہے یہ ہماری شاعری ہی تو ہے۔ ہماری بے شمار حرکات ہمارے شاعرانہ جذبات ہی کے زیرِ اثر ہیں اور اسی لئے ہمارا قومی اور اخلاقی کردار "حرکاتِ مذبوحی" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ قوم پر شاعروں نے جذباتی نفسانی بھوت سوار کر رکھا ہے اور یہی ہمارا کردار بن گیا ہے۔ شاعروں کا طبقہ اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے اپنے ماحول کے اندر ان ہی جذبات کو ترقی دیتا نظر آتا ہے، جس سے شاعر کو "واہ واہ" ملے۔ یہ "واہ واہ" تفریحِ طبع کے عوض ملتی ہے۔ بھانڈ مہنگے ہیں شاعر سستے ہیں۔ آج شاعری کے مشاعرے بد نظمی کے لئے خواہشات کی جولانی کے رستے ہیں۔ جن پر چل کر خود شاعر اپنا جی بہلاتا ہے اور "ہم ہم" کہتا ہوا اتراتا ہے۔ شاعر کون ہے؟ قوم کا ایک فرد ہی تو ہے نا! قوم بھی کچھ قابلِ تحسین امور انجام دیئے بغیر "ہم ہم" کہنا اپنے شاعروں ہی سے سیکھ چکی ہے۔

لیکن سارا الزام شاعروں پہ دھرنا مناسب نہیں، وہ تو خود معاشرے کا آئینہ ہے۔ شاعر اپنے ماحول کے بہت سے جذبات اخذ فرما کر اپنی ذات کے جذبات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ لچرات بڑھاتا ہے، ترقی دیتا ہے۔ جسم بخشتا ہے۔ لباسِ الفاظ پہناتا ہے۔ اپنی تخلیق کے بتوں کو دیکھتا دکھاتا ہے، بھولا نہیں

سکتا، لیکن کم جانتا ہے کہ ان رنگا رنگ کے جذبات کے ذخیرے کو استعمال
میں لاتے ہوئے کہیں نفسیات کا شر تو تخلیق نہیں کر رہا۔ وہ ان جذبات کو اپنی
اُپج کے لباس میں ایک مجسّم آواز بنا دیتا ہے۔ یہ آوازیں لاکھوں ہزاروں میں کیونکہ
ہماری قوم میں لاکھوں ہزاروں شاعر ہیں۔ یہ مجسّم آوازیں کانوں یا آنکھوں کے
ذریعے سے قوم کے اکثر افراد کے جذبات میں کہیں قدرے زیادہ اور کہیں قدرے
کم ہیجان پیدا کرتی ہیں اور اس ہیجان کے طوفان کو بڑھاتی ہیں۔ قوم کے افراد
میں جذبات تو یوں بھی جمع ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن سب جذبات کی صورت گری
کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا شاعر کے الفاظ کو شاعر کے جذبات کے آئینے
میں غیر شاعر لوگ اپنی ہی خواہشوں کی من موہنی صورتیں دیکھتے ہیں اور بقول غالبؔ
کہنے لگتے ہیں کہ ؎

دیکھنے گفتار کی خوبی کہ جو اُس نے کہا،
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

تھوڑی دیر پہلے مَیں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے قومی اور اخلاقی کردار
پر ہماری شاعری کے اثر کا معاملہ بہت سنجیدگی کا ہے مَیں اسے ہنس ہنس کر
جو طفلانہ طرز سے بیان کر رہا ہوں اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ میری آج کی
شام آپ کو وہ نہ کر دے جیسے مَیں نے ترقی پسندی یافتہ لوگوں کی زبان سے سنا
ہے۔ لفظ انگریزی کا ہے اس کے اصل معنی نہ جانے کیا ہیں لیکن مَیں نے متاثر سننے
والے اچھے خاصے جوان جہان پڑھے لکھے لوگوں کے منہ سے سُنا ہے کہ "یار
ہم تو بور ہوگئے"۔ یہ "بور" ہو جانا شاید کوئی اچھی بات نہیں، اس لئے میں نہیں

ملی کردار کا ہماری شاعری پر اثر

چاہتا کہ محض میری گزارش کی شنوائی پر مجبور رہ کر مجھ سے رخصت ہوتے وقت اپنے لئے بور ہونے کا احساس یا اعلان فرماتے ہوئے جائیں۔ سنجیدہ اور قابلِ عمل باتوں سے آپ بور ہو جانے کے علاوہ تو بہر حال ہیں۔ آپ میں سے شاید کچھ ایسے بھی ہوں۔ جو ممکن ہے اس تقریب کے صدر کی زبان سے میرے بارے میں فردوسیؔ اسلام سنتے ہی بور ہو گئے ہوں۔ اس لئے آپ لوگوں میں سے وہ جن کو خطرہ نہ ہو کر شاعر زدہ لوگ "واہ" کہیں گے یا آہ بھریں گے۔ وہ کسی اور مقام پر بیٹھ کر سوچیں، ایک دوسرے کی رائے کا جائزہ لیں۔ پھر کسی متفقہ فیصلے کا اعلان کریں۔ تاکہ وہ مقتدر اصحاب جو قوم کے درد مند ہیں۔ ہم شاعر لوگوں کو بھی ذرا سمجھائیں کہ اپنی قوم کے نفسانی جذبات کے ساتھ کھیلنے کے بجائے کچھ بہتر طریقۂ تخلیقِ شعر اختیار فرمائیں تو ان کی شاعری واقعی بہتوں کا بھلا کرے گی۔ ساتھ ہی قوم کو بھی محض جذباتی طور پر رنگ رنگ کے جذبات سے متاثر ہونے کی خوش مذاقی سے منع یا متنبہ فرمائیں۔ لیکن یہ ایسی آسان بات نہیں۔ کاش ہم میں مشکل کام سر انجام کرنے کی تمنا پیدا ہو جائے۔

رہ گیا میں حفیظ جالندہری، میں آپ کی اس سلسلے میں کیا مدد کروں۔ مجھ پر جو اثر تھا میں نے کوشش کی اس اثر کو حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ کے اثر میں رنگ دوں۔ میں خود محض شاعر ہوں۔ ہر شاعر اپنے آپ کو آفتاب سمجھتا ہے اور چونکہ ؎

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال،
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

لیکن شاعر ذرہ ہو یا آفتاب، بہت متاثر کرنے والا وجود ہے۔ شاہول

کی خدمت میں آپ میں سے کوئی عرض کر سکتا ہو تو ان کو بتائیے کہ حضور والا جذبات کی صورت گری سے بھانت بھانت کے صنم ہی صنم نہ تراشیں، جن کو دیکھ دیکھ کر قوم و ملت کے افراد ہر قدم پر ایک نئی گھڑنت کے آگے پجاری بن کر ماتھا ٹیکتے ٹیکتے اور آہیں بھرتے بھرتے راہوں میں لیٹ جائیں اور زمین آسمان کے درمیان جان بحق نظر آئیں گے۔

ظاہر ہے کہ جدّ و جہد سے بچ کر لیٹ جانے اور سو کر خرّاٹے لینے میں بڑی راحت ملتی ہے۔ اس راحت کے بارے میں ایک شاعر ہی کا قول عرض کرتا ہوں۔ ؎

بقدرِ یک سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، ایستادن، نشستن، خفتن و مُردن

قوم کو تفریح ہی تفریح کے طور پر سکون و راحت عطا فرماتے ہوئے ہماری شاعری کا اثر ساری قوم پر اب یہ ہے کہ ہماری قوم حد سے زیادہ راحت طلب بن چکی ہے۔ راحت اور سکون کے اصل معانی آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب کسی مقصد کے لیے جدّ و جہد انسان کو دوڑاتی ہے تو دوڑنے والے کو اگر یک سکوں راحت لینے کی بات سمجھائی جائے تو دوڑنے کی بجائے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ آہستہ خرامی راحت نظر آتی ہے۔ پھر راحت کی طلب اور بڑھتی ہے جو چلتے چلتے ایک مقام پر ٹھیرا دیتی ہے۔ چلنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کھڑے ہونے، ٹھیر جانے

ملی کردار کا ہماری شاعری پر اثر

میں راحت ہے۔ کھڑے رہنے کے بعد بیٹھنا راحت ہے، بیٹھنے کے بعد لیٹنا راحت ہی راحت ——! یعنی خاتمہ

خاتمہ یعنی یہاں میرا مقالہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ اگر ہماری شاعری ہمیں راحت کے یہ مراحل طے کرا چکی ہے تو اِن شاء اللہ، ورنہ سنبھلئے!

ہماری قوم پر اور ہمارے کردار پر یہ ہماری شاعری کا اثر ہے میں نے سرسری طور پر مقدمہ پیش کر دیا ہے اس کا فیصلہ آپ کے ذمے ہے۔ عدالت آپ ہیں۔ میں تو شاعر ہوں، اور خوش ہوں کہ ؎

پری رُخوں کی زباں سے کلام سُن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

زیرِ صدارت مولانا کوثر نیازی
جب مولانا مولانا ہی تھے

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۱۰ر نومبر ۱۹۶۴ شمسی

عَلّامہ مَشرِقی،

مَوت نے یہ قلعۂ مضبوط بھی مسخر کر لیا۔

یہ قلعہ ایک عظیم فہیم وجود۔ علم و فضل و کمالات کا مجموعہ، گفتار و کردار کی ہم آہنگی کا ایک پیکر، ملّتِ اسلام کے لئے برسرِکار اور دشمنانِ اسلام سے برسرِپیکار یہ قلعہ بھی ہمارے دَور میں اپنی خاص الخاص طرز کے مضبوط تر قلعوں میں اپنی مثال آپ تھا۔

اس دار الحرب میں جس کا نام نیم براعظم ہند ہے، جس میں ایک طرف باطل اور دوسری طرف حق سارے عالم کے رو برو نکھر کر آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ قلعہ اہلِ حق جاں بازوں کی غیرت کی پُرجوش پرورش گاہ تھا۔ اس حق نیوش نے اپنا فرض اپنے ہی انداز سے ادا کرتے ہوئے بیرونی و اندرونی مخالفت کی آندھیوں، طوفانوں کے مقابل اپنی بات پر ثبات کا دم بھرتے ہوئے ملّت کے لئے سرفروشوں کی مخلص ترین جماعت مہیّا کر دی اور وہ کام کیا جو ہمارے دَور میں بے نظیر ہے۔

آج یہ قلعہ منہدم نظر آ رہا ہے۔ لیکن یہ اِنہدام مادّی و جِسمانی وجود کا ہے۔

یہ تو قلعہ کی دیواریں تھیں جو دستِ قضا نے توڑ ڈالی ہیں۔

صورت نظروں سے اوجھل ہوئی ہے، معنی موجود ہیں۔ وہ مجاہد جو اس قلعہ کی قلعہ دار روح نے عزتِ اسلامی کی بنیادوں پر قائم کئے ہیں، وہ خود ملتِ اسلام کے مضبوط قلعے ہیں۔ یہ سب ایک ملتِ واحدہ کے لئے سینہ سپر ہونے کو تیار کئے گئے ہیں۔

علامہ مشرقی کے طریقِ کار سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مقصد کار وہی ہے جو ایک اسلامی سپہ دار کا ہونا چاہیئے۔

علاّمہ مشرقی کے علم و کمالات کی گوناگونی اور بوقلمونی پر اہلِ نظر و فکر مجھ سے بہتر روشنی ڈال رہے ہیں۔ میں تو محض یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے بھی اُن کو قدرے قریب سے دیکھا تھا۔ مرحوم نے بارہا برسرِ راہ ٹوک کر مجھے مخاطب کرنے کا شرف بھی بخشا۔ ہاں برسرِ راہ، کیونکہ وہ بھی اکثر اپنی عظیم شخصیت کے باوجود لاہور کی سڑکوں پر مجھ بے حقیقت، ازلی پیادے ہی کی مانند پا پیادہ چلتے پھرتے تھے۔ ان کی سپاہیانہ وردی، ان کی قائدانہ مگر بے تصنع شاندار وضع اور عزیمانہ رفتار آج بھی میرے تصوّر میں ہے۔ ایک کوہِ پُرشکوہ جو ساری دُنیا کو سدھارنے کے افکار و مہمات اپنے اندر سمائے ہوئے زمین کی چھاتی پر رواں دواں نظر آتا تھا۔

مجھے محض شاعر اور سیاسی و معاشری آویزشوں سے الگ تھلگ فقط شعر و شاعری کے تاثر سے روحوں کو گرمانے والا گردان کر علامہ بے تکلفانہ مجھے پکار لیتے تھے۔ اور میں سلام کرتا تو کلام سے محروم نہ رکھتے۔ بعض اوقات

ان کے ساتھ ان کے چند پیروان کار بھی ہوتے تھے۔ لیکن اکثر علامہ تنہا دکھائی دیتے۔

گفتگو خاکساری پر کبھی نہیں ہوتی تھی۔ محض شکایت ارباب نشاط، دورِ انحطاط یا حاصل کلام یہ ہوا کرتا کہ وہ ہمیشہ جو کام میں بھی کر رہا تھا اس پر مجھے حوصلہ بخشتے اور مجھے میری راہ پر چھوڑنے سے پہلے میرے ہی ایک جاہلانہ ترانے کا بند مجھے سنا دیتے۔ جس میں کبھی زمانے میں میں نے یہ لکھا تھا کہ ؎

تجھے سمجھتے ہیں اہلِ دُنیا خراب خستہ ذلیل رسوا
نہیں عیاں ان پہ حال تیرا کوئی نہیں ہم خیال تیرا
کسی کی پروا نہ کر پیے جا

لیکن علامہ مشرقی میرے پیے جا کو نکال باہر کر دیتے اور اس کی جگہ اپنا جیئے جا رکھ دیتے تھے۔ وہ مجھے جب بھی مخاطب کرتے حفیظ صاحب کہتے۔

ملاقات کا یہ سرسری شرف سرِ راہ کا ہے گاہے اچھرہ کے اڈے پر یا لاہور کے میو ہسپتال سے نیلے گنبد تک لانے والی سڑک پر ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ کیونکہ میں لاہور سے دور دور اور ہی مقامات پر خجل خوار رہتا ہوں۔

تاہم چند سال پہلے میں نے ان کو جس رنگ میں دیکھا میرے نزدیک وہ رنگ مجذوبانہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی اور نے محسوس کیا ہے یا نہیں لیکن اگر میں غلط نہیں کہتا تو گاہے گاہے برسرِ راہ سلام کلام کے دوران میں نے ان کو قدرے جذب کے عالم میں پایا ہے۔ مجھے پکار کر، ٹھہرا کر اب وہ اپنے اشعار سنانا شروع فرما دیتے تھے اور یہ اصرار سناتے چلے جاتے تھے۔ میں چونکہ

ان کو شعر و شاعری کی دنیا سے بہت بلند مقام پر دیکھنے کا عادی تھا مجھے اُن کو محض شعر کی صورت میں اپنے مقاصد کا اظہار فرماتے دیکھ کر اک گونہ تاسف ہوتا تھا۔ کیونکہ شعر کیلئے سر بگریباں رہنا لازمی شرط ہے۔ اور مرد کار و پیکار کو سر بگریباں ہونے کی فرصت کہاں۔

آہ۔ اُن کے اشعار بھی ان کی روحِ مجروح کے تاثرات تھے۔ مجھے علامہ مشرقی کے اشعار سننے کے بعد ان سے مصافحہ کے بعد اپنی راہ لیتے ہوئے ہمیشہ حکیم اُمت شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا اور میری آنکھیں پرنم ہوجاتیں۔ ؎

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

آہ، یہ شعر۔ اس شعر پر کس نے غور کیا ہوگا۔ اقبال کو سمجھ لینے کا دعوےٰ کرنے والوں میں سے اس شعر پر کون رویا ہوگا۔

ہاں کسی کے لئے اس شعر میں رونے کی کون سی بات ہے۔

شعر کو محض لذتِ ذہن سے زیادہ اہمیت نہ دینے والوں اور چٹخارہ لے کر واہ واہ پر بات ختم کردینے والوں کو اس میں ایسی کوئی بات کیوں دکھائی دے ــــ ہما شما کیا، علامہ اقبال کے کلام پر نقد و نظر کے اُستاد بھی سینکڑوں سفید صفحے کالے کرتے ہوئے اس شعر میں شاید ایسی بات نہیں پاتے کہ اس کا خاص طور پر تذکرہ فرماتے۔ لیکن مجھ ایسے بے چارے ہی چند لوگ ہیں جو اقبال کے اشعار میں اس تڑپ کو بھی دیکھتے ہی نہیں بلکہ اپنی روح کو بھی اس سوز سے

گرماتے رہنے کے طالب ہیں جس سوز سے یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ وہی چند بے چارے، اقبال کے اس شعر کے پردے میں ایک ایسا عالم پاتے ہیں جس کی جھلک آنسوؤں کا مینہ برسا دیتی ہے۔

تصور کیجیے۔ اس عظیم حکیم کا جو یہ کہتا ہے ؎

گفتند جہان ما آیا بہ تو می سازد
گفتم کہ نہ می سازد۔ گفتند کہ برہم زن

یہ عظیم حکیم لفظ کی صورت گری ہی سے نہیں بلکہ معنی سے قلوب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ اپنے آنسو بوتا ہے اور ایسے ستارے اگانے کے لئے سینہ کاوی میں لگا رہتا ہے جو کجروی اختیار نہ کریں۔ ساتھ ہی ساتھ زمین و آسمان میں کج روی اور تفرقے کے مارے ہوئے انسانی ستاروں کے ٹکرانے سے جو حشر برپا ہوتا ہے اس سے بھی بے نیاز نہیں۔ ان سب کو راہ پر لانے کے لئے کوشاں ہے۔

اس کی نظر میں انسانیت فقط اس صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے جو قرآنِ کریم کی ہدایات پر انسانوں کو اقطار السماوات سے بھی آگے لے جانے کے لئے انسانِ کامل نے انسانوں کو بتائی ہے۔

اس صداقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تصور تو کیجیے کہ اقبال جو رات دن اقطار السماوات سے بھی زیادہ روشنی حاصل کرنے کے اہل انسانی ستاروں کی چشم بصیرت کھولنے کی فکر میں ساری زندگی گزار دیتا ہے جو حوصلہ اور عزم و ہمت کا پیامی ہے۔ اس پر ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ ؏

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت

اسے ہم لوگ، یعنی انسان بزاں کائناتِ حیات۔ کے اصلی ستارے ہیں اپنی کجروی سے باز آتے نظر نہیں آتے تو اپنی ہمت و کوشش کے باوجود پکار اٹھتا ہے کہ یا اللہ ؎

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا

مجھے یہ شعر آج کل اکثر یاد آتا ہے۔ اور جلال الدین خوارزم شاہ، اورنگ زیب عالمگیر، حافظ رحمت خاں، شہید سلطان ٹیپو، حضرت سید احمد بریلوی، اسمٰعیل شہید، حالی، سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، قائدِ اعظم اور پھر خود حکیم امت کے تصورات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ اور میں کہہ اٹھتا ہوں ؎

اللہ اللہ کیا ہوا انجامِ کارِ آرزو

توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی

یہ سب عالی حوصلہ مردانِ مومن انسانی ستاروں کی کجروی کے اسباب و علل دور کرنے کے لئے کفن بردوش رہنے والے تھے۔

لہٰذا جب میں علامہ مشرقی کو ان کی جد و جہد کے دوران شعر میں اپنے جذبہ کو بھرنے کے لئے سر بگریباں رہنے کا خیال اپنے سر میں پاتا تو مجھے آنسوؤں کے ساتھ اقبال کا مذکورہ بالا شعر یاد آجاتا تھا۔

علامہ مشرقی نے ہمارے جس دور میں ہمارے لئے قدم اٹھایا۔ یہ تاریخی دور ایسے مرحلے پر تھا کہ نظم و ضبط والے سرفروشوں کو مثالی طور پر ایک وحدت میں لاکر دوسروں کے لئے قائم کرنا محال سمجھا جا رہا تھا۔ علامہ نے اس محال کے

لفظ کو محو کر دیا۔

میں نے ان مجاہدوں کو لاہور کے گلی کوچوں میں اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے اور وحدت کا دم بھرتے ہوئے سنہ ۱۹۴۰ء میں سر کٹاتے، گولیاں کھاتے مگر ثبات قدم کے ساتھ اپنے ہی خون سے سرخرو عالمِ آخرت کو جاتے دیکھا ہے۔

یہ مجاہد خاکسار کہلاتے تھے۔ وہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے وہ محض حق پرچم کر کھڑے ہو کر دشمنانِ اسلام کو صبر و ثبات کا اسلامی جوہر دکھاتے تھے ۔

یہ داستانِ خونچکاں میرے نظمیہ رزمیہ میں آ رہی ہے۔ یہاں فقط علامہ مشرقی کی روح کا اثر و نفوذ دکھانا ہی میرا مقصود ہے۔

علامہ مشرقی مجھ عاجز کی نظر میں بہت عظیم الشان وجود تھا۔

وہ قائل تھا فقط اسلام ہی کی بادشاہی کا
دیا اس نے بھی ہم کو درس احکامِ الٰہی کا
نظر ڈالی نہ تھی اس نے کبھی اسبابِ زینت پر
خدا رحمت کرے اس پاک باطن نیک طینت پر

خاکسار جماعت کی [illegible] پر
کتاب کے لئے

شعر، شاعر اور مشاعرے

ایک تاریخی اور انتہائی قیمتی خزانہ میرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ سامنے ڈھیر لگا ہوا ہے جسے میں بلا شرکتِ غیرے جیسے چاہوں استعمال کر سکتا ہوں۔ اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا ؎

وہ سامنے دھری ہے صُراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

اس شعر کے معنی سخن فہم حضرات میں سے کسی نے کیا سمجھے ہیں مَیں نہیں جانتا۔ میری دانست میں یہ معنی آج مجھ پر وارد ہیں۔

حوصلے کے ساتھ تصوّر فرما لیجئے کہ مَیں شاعروں ہی کے طائفے میں سے ہُوں یا شمار کیا جاتا ہُوں۔ میرے دَور کے بہت سے نامی شاعر بہت زیادہ نامور ہو چکے ہیں یا ناموری کی راہوں پر چل رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے اپنے اعمال، اشغال، گفتار اور کردار کے نقاب اُتار ڈالے ہیں۔ نقاب اٹھتے ہی فضا پر گھناؤنا پن چھا گیا ہے

دنیا کی ذہنی آنکھوں کے لئے بھی سینوں میں پوشیدہ آرزوؤں کے

لئے بھی۔ حسن و جمال کو بے نقاب کرنے میں ان شاعروں کا کمال انسانی شرف کی صورتِ زوال ہے۔ ان کے نزدیک بدمعاشی عشق ہے اور فحاشی حسن۔ ان کو یقین ہے کہ ہم دنیا سے منوا چکے ہیں یہ بات، کہ شاعر جب تک شراب خور نہ ہو اور شراب خوری کے ساتھ شرابی جو اشغال رکھتا ہے وہ سب شاعر میں نہ پائے جائیں تو ایسا فرد ہرگز شاعر نہیں ہے واہی ہے۔

مشاعروں کے اندر گھناؤنے، بڑھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے بال سروں پر بکھیرے، شراب میں دُھت شاعر نماؤں کی جو آؤ بھگت ہوتی رہی ہے، وہ تفریح کا سب سے بڑا سامان ہے۔ شعر و سخن سے لذّت لینے والے لوگ بھانڈوں اور ہجڑوں کی بجائے اس رنگ و وضع کے شاعر نماؤں کو اپنے دوستوں کی محفل گرم کرنے کے لئے دعوت دیتے ہیں۔ دوستوں کے لئے پکا ہوا کھانا ان کو کھلاتے ہیں۔ خود نہ بھی پئیں جب بھی ان کو جیسی بھی ملے پلاتے ہیں۔ محفل گرم ہوتی ہے۔ خبط الحواسی کے عالم میں یہ شاعر مے لائے دلا جو کچھ اُن کے منہ سے نکلے، اس کو یہ دعوت دینے والے لوگ، انسانی دنیا پر کسی دوسرے برزخ سے نازل شدہ واردات تصوّر فرماتے ہیں۔

مشاعروں کی تقریبوں میں بہت سے شاعروں کا پیٹ شراب کباب اور ان کی جیبیں لوگوں سے وصول کئے ہوتے چندے اور مشاعرے پر لگائے ہوئے ٹکٹ سے بھری جاتی ہیں۔

میرا مشاہدہ خاصا وسیع ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر شغلِ شراب اور شاہد بازی کسی وجہ سے مشاعرے کی بزمِ عام میں مناسب نہ سمجھی جائے

تو مشاعرہ گاہ کے قریب کسی کونے کھدرے، غسلخانے یا پاخانے میں اُن کی ٹھنڈی رگوں میں گرم شاعری بھر دی جاتی ہے، پھر شاعرِ غُرّاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے آتے ہیں یا دست بدستِ دگرے منظرِ خاص و عام پر لائے جاتے ہیں اور ان کو دیکھتے ہی حاضرین وہ آئے وہ آئے کہتے ہوئے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس منظر کو سامنے رکھئے اور سنئے :-

وہ سامنے دھری ہے صُراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

یہ شعر مَیں نے پھر دُہرا دیا ہے نہ آپ شرابی ہیں نہ مَیں۔ فقط میری تصوّری تنہائی کا ساتھ دیجئے اور تصوّر ہی میں دیکھئے کہ مَیں تنہا بیٹھا ہوں، صُراحی بھری رکھی ہے اور سوچ رہا ہوں کہ میری اَنا ایک پکّا اور بڑا شاعر ہونے کی مُہر مشاعرے سے لگوانا چاہتی ہے، تو کیوں نہ صراحی کی گردن ناپ لوں اور پیالے کے بغیر ہی منہ کھول کر غٹ غٹ اپنے حلق سے پیٹ میں انڈیل دوں۔

ہا ہا۔ اگر میں ایسا کروں اور مشاعرے میں لے جایا جاؤں تو پھر میرے مُنہ سے میلا نکلے یا کڑوا کسیلا چاروں طرف سے واہ وا کے ڈونگرے مجھ پر برس پڑیں گے۔

اس کے ساتھ ہی لگی لپٹی ہوئی ایک اور سوچ بھی کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے۔ وہ یہ کہ یہ تو لعنتیں ہیں جو اس طرح بڑا شاعر متصوّر ہو کر واہ وا کی صورت میں ملتی ہیں۔ یہ شاعری کی تحسین نہیں ہیں۔ یہ تو بدحواسیوں کے پَے در پَے

دلکش نظاروں کی تفریح ہے۔ تو کیا شاعری کا ماحصل یہی واہ وا ہے۔ ؟

واہ وا کو ختم کرنے سے پہلے آپ تصوّر میں نہیں بلکہ جس طرح چاہیں میرے اِس شعر کے معنی مجھ سے پوچھ لیجئے۔ معنی یہ ہیں کہ سامنے صراحی بھری رکھی ہے میں سوچ ہی رہا ہوں، اس سوچ نے مجھے لعنتی واہ وا کا احساس دلایا ہے لہٰذا میں نے ابھی صراحی کو حلق میں انڈیلا نہیں۔ اَب میری نظر دوسرے مصرع پر ہے یعنی دونوں جہان اپنے اختیار میں ہونے کا دعوے۔ اس عالم تنہائی میں سامنے دھری ہوئی صراحی کا عالم۔ پیالہ بھرُوں یا اس کے بغیر ہی صراحی میں جو کچھ ہے شکم رسید کردوں اور پھر اُٹھوں یا اُٹھا کرلے جایا جاؤں اور سخن فہموں یا تماشائیوں کی موجودگی میں اپنے اشعار، تُک بندیاں جھُوم جھُوم کر سناؤں تو یہ دنیائے دوُں موجودہ معاشرے کے ذوقِ سُخن کے سبب میری گرفت میں آجائے گی۔ میں سب سے بڑا شاعر مانا جاسکتا ہوں یہ سب لوگ جو سامنے بیٹھے ہوں گے میری مدح سرائی کریں گے اور مدح سُننا ہی تو اِس دُنیا میں سب سے بڑی انسانی آرزو ہے اور شاعر انسانوں کا اصل نمائندہ مانا جاتا ہے۔

لیکن یہ بَلا، یہ آگ، یہ سیّال شے جو سامنے دھری ہوئی اس صراحی میں بند ہے اگر میں اس کو اُٹھاتا اور پی جاتا تو کیا اس کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں تو ایک اور جہاں میرے ہاتھ آجائے گا۔

سامنے پڑی ہوئی صراحی سے مُنہ پھیرتے ہی میری زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ نکلے گا۔ کیونکہ میں پیدائشی مسلمان ہوں، کلمہ گو ہوں۔ شاعر سہی منافق نہیں ہوں۔

اگر مَیں صراحی کی موجودگی اور اس دنیا کی تفریحی مدّح کی بے ہودگی یعنی واہ وا سے بے نیازی اختیار کر لوں تو یہ ضبطِ نفس میرے دَور کی معاشرتی دنیا میری گرفت میں نہ سہی عقبیٰ کی مسرّت تو ضرور میرے اپنے اختیار میں ہے۔ عقبیٰ کی مسرّت یعنی آگے چل کر بہتر مقام۔

اَب اِس سوال کا حل آپ کے ذِمّے ہے خود اپنے آپ کو اپنے جواب سے خطاب کر لیجئے کہ آیا جو کچھ اس صراحی میں ہے اس کو اپنے پیٹ میں ڈال کر صراحی خالی کر دوں یا پاؤں کی ایک ہی ٹھوکر سے دونوں کو خاک میں ملا دوں — یہ سوال کیا اچھا خاصا امتحان ہے میرا بھی، آپ کا بھی۔

ایک جہان ہے لوگوں کی مضحکہ انگیز تفریحی واہ وا — جو شاعر کو مزید مَے لا کے بعد قے لا پُرخوش رکھتی ہے۔ دوسرا جہان وہ منزلِ مراد جس کی جانب ہر فردِ بشر اپنی حرکات کے ساتھ قدم بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ جس کا دروازہ سب پر کھُلا ہے مگر اس کے اوپر طُغرے کے طور پر عُقبیٰ لکھا ہُوا ہے —— !

—— ایک صدا بصحرا ——

بھارتی حملے سے چند برس پہلے،

کیا یہ درست نہیں کہ پاکستان ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے الزم ہے۔ میں نے "الزم" کہا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں "الزم" کیا ہوتا ہے۔

کیا ہم کروڑوں مسلمان مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں، جوانوں کے لئے اور بھی کوئی مقام ہے جس کو ہم اپنا وطن کہہ سکیں۔ کیا ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم تفرقہ انگیزی اور باہمی لپاڈگی اور ماتھا پھٹول کو اس طرح قائم رکھے رہے اور ہم پر باہر سے حملہ ہوگیا تو کیا اپنے پڑوسی ملک سے مار کھا کر اس کے غلام بن جائیں گے یا بھاگنا چاہا تو کہاں جائیں گے۔ دوسرے اسلامی ممالک تو کیا اگر ہم اسلامی جہاد سے منہ موڑ کر مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ کا بھی رخ کریں تو کیا ہم جیسے تفرقہ انگیز منافقین بھگوڑوں کے لئے وہاں پناہ کا کوئی حق ہے۔

جید قومی اخبارات میں بھی اور قوم و ملت کے سربراہوں کی جانب سے بھی ہر روز پاکستان پر اُمڈ آنے والے سیاہ بادلوں میں کڑکتی بجلیوں کی جھلک دکھائی جا رہی ہے۔ کیا ہم اس بھیانک جھلک کو سینما کے پردوں پر یا بعض اخبارات میں مغربی حسیناؤں کے عریاں ساق سمیں ہی سمجھ رہے ہیں۔ اگر نہیں سمجھ رہے

تو کیا ہماری اپنی نفس نفس کی نفسانی لذت نے اس خطرے کی طرف توجہ دی ہے
جس کی طرف بار بار توجہ دلائی جارہی ہے۔

یہ خطرہ کشمیر کو ہضم کر جانے اور پھر پاکستانیوں کے سر پر ریڈکلف کی
بخشی ہوئی خونی تلوار لٹکانے کی صورت میں نمودار ہے۔

کشمیر کی طرف سے مجھے ایک صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے۔
جو تلقین کر رہی ہے کہ او حفیظ جالندہری تیری شاعری کیا ہوئی اور اے فرزندان
اسلام کہلانے والو خدارا اب تو ایک ہو جاؤ۔ غنیم کا حملہ روک لینے کی محض
زرطلبی کی تمنا ہی نہیں، تمنا کے ساتھ ہی خود بھی اپنی نفسی نفسی کو چند مہینوں
کے لئے ملتوی کر دو۔ اور باہمی اتحاد کے ساتھ ایسے مضبوط بن جاؤ کہ اگر دشمن
تم سے ٹکرانے کے لئے امریکی و برطانوی بجلیاں لے کر آئیں بھی تو اس طرح منہ
کی کھائیں جس طرح راجہ جے پال نے درۂ خیبر میں گھیر کر سلطان سبکتگین پر حملہ کیا
تھا اور منہ کی کھائی تھی۔ کاش آپ انگریز کی لکھی ہوئی تاریخ کی بجائے ایماندار
مورخوں کی تاریخ بھی پڑھے ہوتے۔

آسمانی آواز یہ بھی کہہ رہی ہے۔ پاکستانیو، کشمیر تمہارے ہاتھ نہیں تو تم
خود بھی نہیں ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کشمیر جنت نظیر کی بہار جہنم زار بنی ہوئی
ہے۔ کیا کشمیری مسلمان تمہارے اپنے دینی بھائی بہنیں نہیں ہیں۔ کیا تم ان
کی چیخ پکار نہیں سن رہے ہو۔

کیا تمہارا جواب یہ ہے کہ ہاں سن تو رہے ہیں لیکن یہ ہماری حکومت کا
کام ہے کہ اس چیخ پکار کو بند کرائے۔ ہم خود تو اپنی رنگ رلیوں میں لگے

ہوئے ہیں۔ حکومت امریکہ سے نہیں تو چین سے مدد لے کر غنیم کو سرحد ہی پر روک دے گی۔ ہم تو اپنی ذاتی چلپون چلپون ہی کرتے رہیں گے کیونکہ ہم تو شہری اور دیہاتی لوگ ہیں۔ بھئی ہمیں نہ چھیڑو، ہم تو ابھی ایک دوسرے کی گردن دبوچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے ارد گرد کسی دوسرے کے تن پر کپڑا رہنے دینا گوارا نہیں کرتے۔ اگرچہ خود تو چور نہیں ہیں لیکن جو بھی چور ہے ہم اس کے یار ہیں۔ ہم قاتلوں کے طرفدار ہیں۔ ہم بچوں اور عورتوں کو اغوا، یا قتل کرنے کی محض خبر ہی سے مزا لیتے ہیں۔ ہمیں اور کسی بات سے کیا سروکار!

اس تلخ نوائی کی کسی سے معافی نہیں چاہتا۔ میں تو ایک صدائے باز گشت کو آپ سب تک پہنچا رہا ہوں۔ اس لئے کہ اس سے اہم آواز (کم از کم) آج میرے کانوں میں نہیں سما سکتی۔

کیا ہم میں ایسے لوگ بھی ابھی موجود ہیں جن کو آج بھی یاد ہو کہ جب ہم سب اس بر اعظم کے مسلمان خلافت اور کانگریس کے چند روزہ میل ملاپ کے عارضی وقفے کے بعد شدھی سنگھٹن اور پھر نہرو رپورٹ کے "ہندو مسلم بھائی بھائی" کی اصل صورت بھونچکے ہو کر دیکھ رہے تھے اور ہندو مہا سبھا پوتر بھارت ورش کی دھرتی سے مسلمان کہلانے والوں میں سے چند لاکھ انسانوں کو اس دھرتی ماتا کی گود سے اکھاڑنے کا منصوبہ عمل میں لا رہی تھی۔ جو عربستان افغانستان یا ترکستان سے آنے والوں کی اولاد ہیں۔ اور ان کروڑوں کو شودر اور چنڈال بنا کر پچھاڑنے کا جتن کر رہی تھی۔ جو اس خالص کفرستان مسلمان ہونے کے بعد بھی اس ملک میں آباد ہیں۔ اُس وقت محض کشمیری مسلمان ہی تھے جنہوں

نے سب سے پہلے عملی طور پر آزادی کا علم بلند کیا تھا۔ انگریزی لوہے کی بنی ہوئی خاردار سلاخوں کے اندر سے ایک شیر کی دھاڑ گونجی تھی۔

ہم تو ان دنوں ظاہر و پنہاں برطانیہ کے دامن میں پناہ لے کر اکڑ فوں والے بہادر لوگ تھے۔ اور اس وقت تک یہی سمجھتے تھے کہ کشمیری بزدل لوگ ہیں۔ اور ان پر "حاضرت آپوں ٹھس کر دلیس" کی پھبتیاں اڑایا کرتے تھے۔

ہم ہی نہیں سارے نیم براعظم ہند کے بہادر سیٹھ ساہوکار اور سود خوار بھی یہی خیال کر رہے تھے کہ یہ کشمیری مسلمان بھیڑ بکریاں ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ دو دو من بوجھ اٹھا کر چند پیسوں کے لئے گڑگڑانے والے "ہاتھ" ہیں۔ ہمیں کہاں یاد تھا کہ ان کشمیری مسلمانوں کو بال بچوں، زمینوں اور زمین کے دفینوں سمیت انگریز نے سرزمین کشمیر کے ساتھ ہی پچھتر لاکھ روپے میں بیچ دیا تھا اور یہ سودا ساہوکار ڈوگرہ (جس کا پہلا نام گلاب سنگھ تھا) سے ہوا جو پہلے پہل اوّلین اور آخری سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ساقی گری بلکہ دلالی کرتا ہوا گلابو سے گلاب سنگھ بن گیا تھا۔ اس نے سکھوں کے بعد انگریزوں کی مدد سے جموں کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ گلابو (چند) سنگھ کی اولاد اور برادری مسلمانوں کو بھینٹ چڑھا چڑھا کر جموں کشمیر کی مہاراج ادھیراج بن بیٹھی تھی۔ اور ان کشمیری مسلمانوں کو واقعی بھیڑ بکری بنانے کے لئے کشمیری پنڈت پروہتوں سے کام لیتی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ یہ ہمیشہ کے وارے نیارے ہیں ——

لیکن پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس باڑے سے ایک مسلمان کی آواز شیر کی دھاڑ بن کر گونجی۔ تو نیم براعظم ہند میں واقعی ہلچل مچ گئی تھی۔ کیا آپ میں سے

بھارتی حملے سے چند برس پہلے

کسی کو اس ہلچل کے دن یاد ہیں۔ ؟

نہیں یاد تو میں ہی یاد دلاؤں گا۔ اس دھاڑ کو سُن کر ڈوگرے سیٹھ مہاراج نے اپنے منیم کلرک جس کا نام کاگ تھا، بُلایا۔ وہ انگریزی گماشتے بھی ساتھ لایا۔ سب نے اس دھاڑ کا مُنہ بند کرنے کے لئے انگریز دیوتا کا پچھتر لاکھ کا پَتّر دیکھا اور جانچا ــــ !

پھر انگریزی بندوقوں کی گولیاں چلیں، ہتھکڑیاں، بیڑیاں جھنجھنائیں لیکن شیر دھاڑتا رہا اور وہ لاکھوں جن کو بھیڑ بکری گردانا گیا تھا۔ اپنی پُرانی شیرانہ خُو پر آ گئے۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کیفیّت کو بیان کرنے کے لئے ایک لمبی نظم اپنے تاریخی نظمیہ پاکستان کے لئے لکھی تھی آئندہ اس میں سے چند بند پیش کروں گا۔ کیوں پیش کروں گا اس لئے کہ محض دوسروں ہی کو الزام دے دے کر ہم خود پاکستان کے گلی کوچوں میں ایک دوسرے کی گردنیں پکڑے ہوئے زندہ باد پاکستان کا لیبل پر چھپی ہوئی کہہ بیٹھے ہیں۔

رہ گئی حکومت تو ہم مسلمانوں نے کانگریسی بگلہ بھگتوں کے ساتھ میل ملاپ کے دنوں غیر ملکی حکومت کے خلاف اتنا ہی سیکھا کہ حکومت چاہے کسی معاملے میں اچھائی بھی کرے، جب بھی الزام ہی دیتے جاؤ۔ کانگریسیوں کا مقصود تو یہ تھا کہ لیگ یا خلافتیں نہیں کانگریسی بگلہ بھگت برسرِ اقتدار آجائیں اور ہمارا گلا اس طرح دبائیں کہ اسلام کا نام تک بھول جائیں۔

اب وہ بگلہ بھگت آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا منصوبہ

بنائے بیٹھے ہیں۔ کشمیر تو پچھتر لاکھ روپے میں لاکھوں مسلمانوں سمیت بیچا گیا تھا۔ انگریز اور انگریزوں کے بھائی امریکی انگریز آپ کو خون اور آگ کے کس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچنے یا کوئی بتائے تو سننے کی۔ سن لیں تو کچھ کرنے کی طرف توجہ فرمائی ہے؟

ہمارے کلمہ گو اچھوت

یہ آپ کی فرمائش کی تعمیل ہے۔ معاف فرمائیے گا۔ ہم مسلمان کہلانے والوں کی گنتی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا شاید۔ اپنے اپنے ملکوں کی مردم شماری کی رُو سے اُنہی ملکوں کے مسلمانوں کو اپنی تعداد کا علم ہو تو ہو، دُنیا بھر میں کوئی ادارہ ایسا (شاید) ابھی تک نہیں ہے جو ہر مقام کے مسلمانوں کی تعداد ایک گوشوارے میں جمع کر دینے کا تکلّف برداشت کرے۔ اور اس گوشوارے میں صداقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ملک کے مسلمانوں کی معاشرتی، ذہنی و سیاسی کیفیات و حالات کو دوسروں کے لئے آئینہ بنا دے۔ اگر ایسا کہیں ہو چکا یا ہو رہا ہے تو بعد از تلاش بسیار، میں ابھی تک بے خبر ہوں۔ اِن سطور کے پڑھنے والوں میں سے کسی کو کسی ایسے ادارے کا علم ہو تو مجھے نوازے۔

جب پاکستان کے سبب مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا ـــــ اگر آپ یقین فرما سکیں تو اِس سلسلے میں میرا بیان یہ ہے کہ ہر طرف قاتل، ہر جگہ قاتل مسلمانوں اور مسلمان کُنبوں کو خاک و خون میں ملا دینے کے لئے گھوم رہے

تھے. مَیں اُن دنوں شملے میں تھا. قوم کے باپ کا بھیجا ہوا. مارچ ۱۹۴۷ء کے آغاز سے ستمبر ۱۹۴۷ء تک مَیں اپنے کُنبے سمیت شملے ہی میں تھا. میرے ذمّے ایک بہت اہم اور نازک فریضہ قائدِ اعظمؒ کو ہر ہفتے ایک خبر سے باخبر رکھنا تھا — .

مَیں نے اپنی زندگی میں کام دھندے تو بہت کئے. شعر و شاعری کو قوم و مِلّت کے لئے مفید بناتے چلے جانے کی دُھن تھی. اکلِ حلال سے پیٹ پالنے کے لئے قلم کے بیلنے سے بھی بہت پاپڑ بیلے ہیں. لیکن لیڈری یا لیڈروں کی پُشتی بانی کا شرف حاصل کرنے سے محترز ہی رہا. لیکن شملے میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے چشم پوشی محض اپنی جان بچانے کے لئے ممکن نہ تھی. یہ مرحلہ میرے لئے عجیب و غریب تھا، جو مجھے سچائی کے ساتھ اپنے قائدِ اعظمؒ کے حضور بیان کر دینا تھا. برِ اعظم کی تقسیم کے بارے میں پاکستان کی جانب سے جو لوگ باؤنڈری کمیشن میں کام کر رہے تھے ان کے خیالات اور احساسات کے اُتار چڑھاؤ اور ان کے مدِ مقابل سمندر پار سے آئے ہوئے بندر بانٹ کرنے والوں کے گرد گھیرا ڈالنے والے دلّالوں کے بھاؤ تاؤ، مول تول دیکھنا اور کُڑھنا میرا ہی حصّہ تھا. ایسے بھاؤ تاؤ اور اُتار چڑھاؤ کے کُڑھاؤ میرے مشاہدے میں تھے جن کے نیچے مسلمانوں ہی کی عزّت، حُرمت، ناموس، جسم، جان اور ایمان کی ہڈیاں جلائی جا رہی تھیں، مسلمانوں ہی کا نچُڑا ہوا لہُو اُبالا جا رہا تھا. مَیں نے اس صورتِ حالات سے قوم و ملک کے بانی کے بہت ہی قریبی یعنی بڑے بیٹوں کو خبردار کرتے رہنے کا فریضہ بھی لازم گردانا. شملہ سے دہلی پہنچ پہنچ کر

اپنی زبان سے ہر ہفتے کام لیتا رہا۔ زاہد حسین میرا پیغام پہنچاتے تھے۔

اس بات کو پھر سمجھ لیجئے کہ اپنے ہی نمائندوں کے احساسات و خیالات کا اُتار چڑھاؤ اور پھر تولنے والے کے سچی معیار یعنی تکڑی ترازو کے ذریعے اِس اُتار چڑھاؤ کا اصل سبب اور بھاؤ تاؤ کے بڑھنے گھٹنے اور پہلو بدلنے کے ساتھ ساتھ ترازو میں ڈنڈی مارنے کا عمل میرے لئے بھیانک تھا۔ تولنے والے بازو میں نبضوں کی پھڑک، زیادہ کھا پی جانے کی لگن کا ردِ عمل۔ تول میں کمی بیشی کے لئے دہلی میں بیٹھنے والے بَبیٹھن نامی انگریز شاہی کے سب سے بڑے چوٹی دار دلّال کی "کن پھُسیاں" اور بٹی آنکھوں کے اشارے جن کے سامنے اگرچہ ہمارے نمائندے عہدوں کے لحاظ سے اچھی خاصی قامت کے تھے۔ مگر اُن کے حوصلے مری ہوئی اصل سے بھی زیادہ مردہ و افسردہ نظر آئے۔ مَیں فقط شاہد تھا۔ اور میرا خدا شاہد و عادل ہے کہ مَیں نے بابائے پاکستان تک یہ سب کچھ پہنچا دیا تھا۔

اَب وقت گزر چکا ہے اور اس کی یاد ع اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ انگریز کے مزاجی دلّالوں سا ہوکار اور تولنے والے کی ڈنڈی مار حرکات نے جو کچھ مسلمانوں کے پلڑے میں رہنے دیا اس کا آدھے سے کم بکھرا پڑا ہے۔ آدھا جا چکا۔

پاکستان کے ہما شُما ہم انسان جو ابھی مسلمان ہیں اپنے دین ایمان کے ساتھ رہنے بسنے کی خوشی میں بغلیں بجا رہے ہیں۔ وہ جو دوسرے دین دھرم کے لوگ ہیں ان پر ثابت کر رہے ہیں کہ ہمارا دین ایمان انسان کی ایسی ہی بہتری کیلئے ہے ہمارا وجود مسلمان کے سوا ہر انسان کی مسرّت کے لئے ہے۔ ہم ساری دُنیائے انسانی کی ترقی چاہنے کا ایک نمونہ ہیں۔ ہمارا ماتھ تو دیکھیے کتنا باوقار ہے ـــــ!

ہم کہتے بھی ہیں سُنتے بھی ہیں کہ پاکستان کے مسلمان ساری دُنیا میں اسلامی ملّتِ واحدہ کا ایک بہت بڑا حصّہ ہیں اور یہ حصّہ اس ملک کا مالک ہے جس کا نام پاکستان ہے — ہم دعوے دار ہیں کہ ہمارا ملک سارے کرۂ ارض پر واحد ایسا ملک ہے جو اسلامی مساوات و اُخوت کا علمبردار ہے۔

چونکہ نیم براعظم ہند میں ایک ہزار سال حکمران رہنے والے مسلمانوں کو، "جاتی پاتی" اکثریت اچھوت ہی سمجھتی رہی تھی۔ لہٰذا ہم نے اپنا گھر الگ کر لیا تھا تاکہ ثابت ہو جائے کہ نہ ہم اچھوت ہیں اور نہ دنیا میں کوئی اور انسان اچھوت ہے۔

یقیناً ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اسلامی ملّتِ واحدہ کا دین و ایمان ہی انسان کی مساواتی معاشرت ہے اور اس معاشرت کا سامان ہے ہمارا دین ہماری سیاست ثقافت اور ایمان۔ ہم رات دن وِرد کرتے ہیں کہ آخرت کی کھیتی ہماری دینوی زندگی ہے۔ اسلامی ملّتِ واحدہ سینکڑوں ہزاروں مقامات اور بیسیوں ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان مسلمانوں کی نسلیں، قومیتیں، رنگ ڈھنگ، عاداتُ و اطوار الگ الگ ہیں لیکن اس رنگا رنگی میں اسلام ہم آہنگی ہے۔ یہ ہم رنگی ہے ایک کلمۂ طیّبہ کو زبان سے کہنے اور دل سے ماننے رہنے کی ہم آہنگی۔ اور یہ ہے۔ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کلمہ پڑھنے والا کالا ہو یا گورا، عربی ہو یا عجمی۔ ایک اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جس کے حکم کی تعمیل ہم کریں۔ یہ حکم ایک کتاب قرآن میں حرف بہ حرف موجود ہے — ہم مانتے ہیں کہ اللہ کے احکام ہمیں اس وجودِ پاک کے ذریعے پہنچائے جا چکے ہیں جن کا اسم مبارک زبان پر

آتے ہی ہم درود پڑھتے ہیں۔ اگرچہ اس درود کے معنی اکثر نہیں جانتے۔

لہٰذا ہر وہ انسان جو یہ اعلان اپنی زبان سے کرتا ہے کہ میں کلمہ طیبہ پر ایمان رکھتا ہوں، وہ ایک واحد نظریۂ حیات کی وجہ سے ایک واحد ملت میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ کسی رنگ کا ہو، کسی ملک میں رہتا ہو، مالدار ہو یا مفلس طاقتور ہو یا کمزور، ایک واحد برادری کا فرد ہے۔ برابر کا فرد۔ برادری کو اخوت کہتے ہیں، اور برابری کو مساوات۔

اگر ایک آدمی کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے۔ یعنی اس واحد اسلامی برادری کا ایک فرد ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ تو خواہ وہ جھاڑو ہی کیوں نہ دیتا ہو، گندگیاں ہی صاف کیوں نہ کرتا ہو۔ خواہ وہ تخت ہی پر کیوں نہ متمکن ہو۔ عالم ہو یا جاہل پیر ہو یا مرید، حاکم ہو یا محکوم، تاجر ہو یا خریدار۔ بڑا کرخندار ہو یا ٹوکری ڈھونے والا مزدور۔ اس برادری میں سب کے سب برابر ہیں۔

ہم پکار پکار کر دنیا کو بتاتے ہیں کہ مسلمان ایک ملتِ واحدہ ہیں۔ اس طرح جیسے ایک انسان کا جسم۔ آپ کا جسم۔ میرا جسم۔ کسی افسر کا جسم۔ کسی ماتحت کا جسم۔ گھر کا پاخانہ صاف کرنے والے کا جسم اور پاخانہ میں اپنے پیٹ کی نجاست خارج کرنے والے کا جسم ہر ایک کا جسم ایک ہے اور سب مل کر ملت ہیں۔ تو یہ سب جسم اعضاء ہیں اس جسمِ ملت کے۔

پاخانہ صاف کرنے والا کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے تو مسلمان ہے۔ وہ ملتِ واحدہ کا ایک حصہ ہے وہ ناپاک نہیں ہے وہ ایسا ہی مسلمان ہے جیسے ہم۔

کیا ہر صبح یا جس وقت بھی حاجت پیش آئے۔ اگر صاحب بہادر ہیں

تو فلش والے کموڈ پر اور اگر مجھ ایسے ہیں تو چوکی کھڈی یا کھیت میں بیٹھ کر اپنے پیٹ کا فضلہ خارج کرتے ہیں یا نہیں۔؟

ہاں، یہ فضلہ ناپاک ہے لیکن آپ اپنے بائیں ہاتھ سے اس فضلے کے اخراج کی کثافت کو دھوتے ہیں، داہنے ہاتھ سے لوٹے میں پانی انڈیل کر اس کو دھو ڈالنے کے لئے بایاں ہاتھ استعمال کرتے ہیں یا نہیں کموڈ والوں میں سے چند کاغذ سے رگڑ ڈالتے ہیں۔ کھیت والے مٹی کے ڈھیلے سے۔ لیکن اپنے ہی داہنے یا بائیں ہاتھ سے کام لیتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ بایاں یا داہنا ہاتھ جب آپ اسے بھی دھو ڈالتے ہیں تو آپ کے جسم کا حصہ رہتا ہے یا نہیں۔ کیا آپ اس ہاتھ کو یہ گندگی صاف کرتے وقت جسم سے الگ کر لیتے ہیں؟ اور حاجت پوری کرنے کے بعد پاخانے ہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔؟

نعوذ باللہ۔ ہائے کیسی گندی باتیں آج یہ شخص کر رہا ہے۔

ہاں، میرے بھائی۔ ہاں میری بہن۔ مگر مجبوری ہے۔ کیونکہ گندے کام ہر انسان ہر صبح شام کر رہا ہے۔ میں تو یہاں آپ کو فقط یاد دلا رہا ہوں وہ ہاتھ دایاں ہو یا بایاں جس سے میں نے اور آپ نے بھی آلودگیاں دور کی ہیں۔ ہم سب نہ سہی کیا ہم میں کوئی ایک فرد بھی ایسا ہے جو اپنے ہاتھ کو اپنے باقی جسم سے الگ رکھ کر اس کو ہمیشہ کے لیے ناپاک اور اچھوت سمجھتا ہو۔

مجھے یقین ہے کہ آپ ہاتھ کو دھو ڈالتے ہیں تو اس ہاتھ کو پاک

سمجھ لیتے ہیں اور پاکیزہ سے پاکیزہ، مقدس سے مقدس چیز کو یہ ہاتھ لگانے سے پرہیز نہیں کرتے۔ بعض چیزیں کھانے کی بھی ایسی ہیں کہ آپ دونوں ہاتھوں سے ان کو اپنے دہن بلکہ دانتوں تک لے جاتے ہیں۔ اور وہ کھانے کی چیز بھی اس ہاتھ کے لگنے سے ناپاک نہیں ہو جاتی جس سے آپ نے استنجا کیا تھا۔ یا اپنے پیٹ سے گندگی نکلنے کے بعد مقام اخراج دھویا تھا۔ اب آپ سوچئے تو سہی کہ وہ شخص مرد یا عورت جس کو آپ بھنگی، بھنگن، چوہڑا چوہڑی۔ دھوکا دے کر اس سے گندگی اٹھوائے چلے جانے کا کام نسلاً بعد نسلاً لیتے چلے جانے کی نیت سے اس کو بہتر۔ نر کو تمسخر کے طور پر جمعدار جمادار جی، مادہ کو جمادارنی کہہ کر عزت بخشتے ہیں۔ کیا آپ یہ ملتِ واحدہ میں سے ایک ہونے کا ثبوت اپنی ذات کے لئے دے رہے ہیں۔ حالانکہ ان انسانوں کی زبانوں پر بھی کلمۂ طیبہ آپ سنتے ہیں۔

کیا آپ ملتِ واحدہ کے اعضا کاٹ ڈالنے اور ان اعضا کو دین سے خارج رکھنے کو اسلامی مساوات و اخوت بیان کرتے ہوئے شرماتے نہیں۔!

ان کو اچھوت سمجھنا آپ نے کہاں سے سیکھا ہے۔ کیا آپ کو بتایا نہیں گیا کہ آدم زاد کے لئے کوئی آدم زاد اچھوت نہیں۔ اور پھر جس نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام کا اعلان کیا ہے وہ تو ملتِ واحدۂ اسلامیہ کے جسم کا ایک حصہ ہے۔

اگر اس کے جسم پر یا کپڑوں پر گندگی ہے تو اس سے ایسے عالم میں لمس یا اس سے مصافحہ معانقہ کرنے سے پہلے آپ کے لئے اسے پاک صاف ہونے

کا مشورہ دینا چاہیئے۔ اسی طرح جیسے آپ کے ہاتھوں میں گندگی لگی ہوئی ہو
تو آپ جب تک اسے پاک نہ کریں اس کو اپنے جسم کے دوسرے حصّوں
پر لگنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ جب پاک کر لیتے ہیں تو کوئی پرہیز باقی نہیں رہتا۔
تو کیا جب آپ کا بہتر نہا دھو کر صاف کپڑے پہن لیتا ہے تو وہ اسی طرح
سے پاک نہیں ہے جیسے آپ اور آپ کے دوسرے ملنے جُلنے والے۔

تحقانہ ہو جاییئے۔ غور فرمایئے کہ اس نیم براعظم میں ہندوؤں سے سیکھ کر
ہم نے چھوُت چھات کو کس طرح اپنی زندگیوں کا تعویذ بنا رکھا ہے۔ ایسا تعویذ
جس نے ان تمام لوگوں کو جو ہماری ہی طرح انسان ہیں جو ہندوؤں کے
مظالم اور نفرت کے مارے ہوئے ہم سے اسلام کا درس لینے کے لئے
ہمارے خادم ہیں۔ کلمہ پڑھتے ہیں۔ مسلمان ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ ہم نے اُن کو
حتمی طور پر رفتہ رفتہ عیسائی ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور اب تک کرتے چلے
جا رہے ہیں اور پاکستان کی بہت بڑی طاقت اسلام دشمنوں کے ہاتھوں
اس ملک کی بیخ کنی ہماری اسی پاکیزہ چھوُت چھات کے چلن سے ہو رہی ہے۔

کیوں اسلامی معاشرہ نہیں

مجھے یا آپ سب کو اسلامی معاشرہ قائم ہوتا دیکھنے میں جو دِقت پیش آ رہی ہے۔ در اصل ہماری اپنی ان معاشری خرابیوں کے سبب سے ہے جن سے ہم خود اپنے آپ کو بری، پاک یا معذور سمجھتے ہوئے دوسروں پر طعنہ زن ہیں۔ یہ خرابیاں جو ہماری عاقبت کو ناصواب بنا چکی اور دُنیا کا شدید ترین عذاب بن چکی ہیں ان کو ہم نے بہت پہلے لے پالک بنا کر، اپنا ایمان، اپنی جان کھِلا پلا کر پالا پوسا تھا۔

آج یہ سنپولیے اژدہا بن کر ہم سب کو جکڑے ہوئے ہیں۔

گندگی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں کو اگر دفن نہ کیا جائے تو ان میں سے بُو سڑاندھ اُٹھ اُٹھ کر گوناگوں انبار در انبار گندگیاں پیدا کرتی ہے ہواؤں اور فضاؤں کو بیماریوں سے بھرتی ہے یا نہیں ؟

ذہنی اور معاشری زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ ہم اپنے خیال و اعمال کی رنگ برنگی گندگیوں کو لپٹائے ہوئے ہیں اور شکایت کر رہے ہیں بدبُو ہے، سڑاندھ ہے، جی متلاتے ہیں۔ بیمار ہیں۔

ہم سب بیمار ہیں۔ بیماریوں کا رونا بھی روتے ہیں لیکن نہیں دیکھتے کہ یہ تعفن کہاں سے سر اٹھاتا اور وبائیں پھیلاتا ہم میں سے رہی سہی توانائی والوں کو بھی لاشوں کا ڈھیر بناتا چلا جا رہا ہے۔

یہ کرۂ ارض انسانوں کا جنگل ہے۔ مسلمان بھی اسی جنگل کے خطۂ دار حدود میں آباد ہیں۔ ہم بہت سے مقامات پر گنجان باغ یا وسیع راغ ہیں جھاڑیاں بیلیں شاندار درخت اور شاخیں، پھول پھل ہیں۔

ہم سب آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ جھاڑی جھاڑی سے اُلجھتی ہے۔ درخت درخت کو گرا رہا ہے، شاخیں ایک دوسری کو نیچے اوپر، دائیں بائیں ریلتی دھکیلتی، دباتی ٹکراتی ہوئی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہیں۔ ہمارے اپنے لگائے ہوئے زرعی باغ بغیچوں یا جنگلی پھل کچے بھی پکے بھی گر رہے ہیں، سڑتے ہیں، کیڑے مکوڑوں کے پیٹوں میں پڑتے ہیں۔

جھاڑیوں درختوں کو تو قدرتی ہوائی آندھیاں آپس میں ٹکراتی اور ٹھکراتی ہیں مگر ہمیشہ تشریف نہیں لاتیں، مدتوں کے بعد قدم رنجہ فرماتی ہیں لیکن ہم مسلمان۔ انسانی زندگی کے باغ بغیچوں، جنگلوں کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے والی آندھیاں سماوی اور طبعی نہیں یہ تو انسانوں کی اُٹھائی ہوئی ہیں۔

ہم مدتوں سے آندھیوں کی زد میں ہیں۔ یہ آندھیاں اسلام دشمنی کی تحریکیں ہیں جو مسلمانوں کے دینی ذہن کو برباد کرنے کے لئے سوچ سمجھ کر آج سے بہت ہی پہلے چلائی گئی تھیں۔

کیوں اسلامی معاشرہ نہیں

فرنگ (یورپ) سے صلیبیوں کی یورشیں اور اسلامی ممالک پر خصوصاً ایک یلغار اُٹھی تھی۔ یہ پے در پے طوفان خیز آندھیوں کی صورت میں عیسائیوں کے دھاوے تھے فلسطین، عراق اور شام پر مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت کے مسلسل مظاہرے

خلافتِ عباسیہ کمزور ہو چکی تھی اور اسلامی سلطنت کی وحدت قائم نہ رہی تھی۔ عیسائیوں نے بیت المقدس ہی نہیں اِرد گرد کے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور لاکھوں مسلمان قتل اور لاکھوں اینٹ مٹی پتھر کھودنے کے لئے پابہ زنجیر غلام بنا لئے تھے۔ آخر سُلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہد اور سرداروں کی قیادت میں پرچم ہلال سے صلیب بردار فرنگ نے شکست کھائی اور بھگا دیئے گئے۔

ان ڈاکو قاتلوں کو بھگا کر مسلمان سمجھے کہ الحمدُ للہ اب ہم اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ لیکن اس شکست کے بعد افرنگ نے مسلمانوں کو برباد کرنے کے لئے ایک نیا پینترا بدلا۔ قلوب میں کسی نہ کسی صورت میں کارفرما دینی روحِ جہاد کو مسلمانوں کے پیکر سے نکالنے کے لئے نظریاتی پراپیگنڈے کا ایسا حربہ استعمال کرنا شروع کیا جو واقعی کارگر ثابت ہُوا۔ ہم فرشتے بن گئے۔ ہماری وُہ توحیدی رُوح گُم ہوگئی جس رُوح کا یہ ایمان تھا کہ مجاہد زندہ رہے تو غازی اور جہاد میں کام آجائے تو شہید کا رُتبہ حاصل کرلیتا ہے۔

جب یہ رُوح کمزور کر دی گئی تو افرنگ کے صلیبوں نے چاروں طرف سے ہر مقام پر مسلمان کا گلا دبوچ لیا۔ اور آج تک دبوچے ہُوئے ہیں۔

کیوں اسلامی معاشرہ نہیں

اس وقت ساری دنیا نے اسلام کا تذکرہ نہیں۔ اس وقت پیش وہ مسلمان ہیں جو ہندوستان پر کئی سو برس سایہ فگن رہے، وہ مسلمان جن کے کردار نے ہندوستان کو جنت نشان بنا دیا۔ یہ حاکمانہ سایہ نہیں تھا یہ تو اسلامی طرزِ زندگی تھا یہ علماء و صلحا کی تبلیغ تھی۔ جو گفتار و اطوار کے زور سے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو سرنگوں کر رہی تھی۔ یہ انسانیت کا سایۂ عاطفت تھا، یہ شریفانہ انداز و اطوار تھے۔

لیکن بادشاہوں، نوابوں، درباریوں اور ان کے ڈوم دھاڑیوں نے لذتِ عیش و عشرت اور چنگ و رباب کی رنگین صورت زندگیاں بسر کرنا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ اسلام کی رُوح سب بادشاہوں کے تن سے اور ان کے درباریوں کے قالبوں سے نکلی۔ اگر کسی بادشاہ میں کسی وقت پلٹ بھی آئی تو درباریوں نے اس بادشاہ کو قتل کرا دیا۔ برطانوی افرنگی تاجر کا رُوپ بھر کر ان ہی درباریوں کی سازباز سے دولتمدار بن گئے۔

یہ درباری کون تھے۔ آج کے درباریوں سرکاریوں کے دادا پردادا لوگ۔ جب انگریز سرکار دربار بن گئے تو ان کے ہاتھ مسلمانوں کو بیچ دینے والوں کی اولادیں مسلمانوں کے ذہن اور عمل میں سے رہے سہے اسلامی اطوار نکالنے کی آلۂ کار بن گئیں۔

بادشاہ یا درباری جیسے بھی تھے لیکن مسلمانوں کی تعلیم گاہیں مسجدوں ہی سے وابستہ تھیں۔ انگریز نے قرآنی اطوار کی پاکیزہ تعلیم کے مراکز مساجد کو رزق اور عہدہ کے منافی بنا دیا اور ایسے اسکول اور کالج قائم کئے جو رفتہ رفتہ چھلکے کی

راہ دکھانے والی دلالی کے گڑھ بن گئے۔

یہ سب کچھ اس انداز سے کیا گیا کہ بہ اسلام کُشی کا مُدّعا ادعائے اسلام کا دعوے قائم رکھنے والے عامۃ المسلمین کو نظر ہی نہ آیا۔

آج افرنگ اپنے رنگے ہوئے سیاروں کے ذریعے ہماری رگ رگ میں بسا ہوا ہے۔ وضع قطع سے کچھ بھی نظر آئیں ہم سب افرنگی رنگ سے رنگے ہوئے ہیں اور اپنی اولادوں کو بسم اللہ بسم اللہ کہتے ہوئے انہی دلالوں کے سپرد کر رہے ہیں جن کا مقصود بے حیائی یعنی چکلہ ہے۔

میرے بزرگو، دوستو، عزیزو۔ اگر ہم شاخوں کا ٹکرانا دیکھ کر شاخوں کو کاٹنے کی فکر کرتے رہے نہ کٹ سکیں تو ان ہی کے ذکر سے آہیں بھرتے رہے خود وبا کے شکار رہنے کے باوجود دوسرے بیماروں سے بچنے کے لئے دوسرے بیماروں کا گلا گھونٹتے رہے، اپنی اولاد ہی سے رشتۂ پدری و فرزندی کے ٹوٹنے پر واویلا کرنا لازم گردانا اور اصل دشمن، اصل غنیم کو نہ پہچانا تو ہمارا خاتمہ ہے ہمارا کے معنی ہیں ہم سب کا ملک سمیت ــ!

صورت حال یہ ہے کہ صلیب کے سیاہ بادل ہر اُفق پر ہلال کو دبوچے ہوئے ہیں۔ یہودی ساری صلیبی طاقتوں کے پیچھے تحریک و تبلیغ ہیں ان کو اسلام نے مدینہ منورہ اور خیبر سے نکالا تھا۔ آج وہ فلسطین اور بیت المقدس پر قابض ہیں رُخ ان کا مدینہ منورہ کی طرف ہے۔ صلیبی طاقتیں ان کے اشاروں پر چل رہی ہیں ــــ ان کے علاوہ بھارت کے ہندو ہیں ــــ اور ہم ــ ہم افرنگی سے ہم رنگی کے مظاہر ہیں۔ لیکن ہماری زبانوں پر اسلام اسلام کا نعرہ ہے۔

کیوں اسلامی معاشرہ نہیں

ہم دشمنوں کے مقابل جہاد کی بجائے باہمی فساد میں مبتلا ہیں۔ درخت درخت پر، شاخیں شاخوں پر اور کچے پکے پھل ایک دوسرے پر گر رہے ہیں۔ خود بھی ٹوٹ رہے ہیں۔ اپنے ہی جیسے دوسرے کلمہ گوؤں پر۔

آؤ تلاش کریں۔ آؤ ڈھونڈیں۔ کہاں کہاں اِن تمام خرابیوں کی کلیں لگی ہوئی ہیں، یہ آندھیاں یہ جھگڑے مسلسل کیوں ہیں۔ آؤ ان کلوں کو اُکھاڑ پھینکیں آؤ اِن کے کل پُرزوں کا تہس نہس کریں۔ اگر ہم نے جلد از جلد یہ نہ کیا تو رہا سہا ذہنی روحانی اور جسمانی باغ جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو اپنی زبانوں سے مُسلمان کہہ رہے ہیں کم از کم پاکستان میں تو باقی نہیں۔ اور پاکستان بھی برباد — !

آہ کیا برباد ہونا آپ جانتے ہیں کسے کہتے ہیں ؟

میں آپ صاحبان سے کچھ زیادہ عقل مند یا بہادر نہیں۔ میں نہ لیڈر ہوں نہ مُصلح۔ البتہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں اِن آندھیوں میں آیا ہوا بگولہ ہوں اور میری ہی طرح سب ہیں۔ ہمارا ناچ اپنی قبروں پر ہے۔

سب سے زیادہ مظلوم ہماری مسجدیں، اور مسجدوں میں اذان دینے والے نماز پڑھانے اور خطبہ سنانے والے ہیں۔

؎ ملاحوں کو الزام نہ دو، تم ساحل والے کیا جانو
یہ طوفاں کون اٹھاتا ہے یہ کشتی کون ڈبوتا ہے

مجھے اور آپ سب کو جان لینا چاہیئے کہ ہم کیوں ڈوب رہے ہیں۔ کاش ہمیں نظر آ جائیں وہ پتھر جو ہم میں سے ہر ایک کے گلے میں بندھے ہوتے ہیں۔ کیوں یہ ہم کو نیچے ہی نیچے لئے جا رہے ہیں۔

کیوں اسلامی معاشرہ نہیں

یاد رکھیئے۔ یہ پتھر خوبصورت زیوروں کی ذہنی صورت میں ہماری گردنوں میں آج سے نہیں، انگریز بہادر کے ملک سنبھال لینے کے عین بعد سے بندھنے شروع ہو گئے تھے۔ اور اب انگریز تو دور اپنے جزیرے کے ساحل پر کھڑا ہنس رہا ہے اور ہم اس کے پیدا کردہ گندگی کے اس گندے جوہڑ میں ڈوب رہے ہیں جس پر دور سے رنگا رنگ روشنیاں جھلکائی جا رہی ہیں۔

کاش ہم مان لیں کہ ہمارے گلوں میں پتھر بندھے ہوئے ہیں

کاش ہم یہ بھی جان لیں کہ ان پتھروں کے بندھن کا آغاز، ان صاحب نما چھوٹے صاحبوں، بڑے صاحبوں کے باپ داداؤں کے ذریعے کیا گیا تھا۔ جن کے ہاتھوں آج ہم تعلیمات کی چٹانیں اپنے بچوں کے گلوں میں بندھوا رہے ہیں۔

یہ آغاز ساری دُنیا کے ممالک پر مختلف رنگوں کی نمائش سے کیا گیا تھا۔ مقصود اسلام کا نام لیتے ہوئے بھی اسلام سے عملاً الگ کر دینا تھا۔

نیم براعظم ہند میں حالات صلیبیوں کو مسلمانوں کی بربادی کیلئے زیادہ سازگار نظر آئے۔ بربادی کا آغاز تعلیمات سے کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تعلیم و تربیت مسجد سے وابستہ پاکیزہ نگاہی کی بنیادوں پر آغاز کی جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ رہنے والی کثیر التعداد اقوام جو مندروں، پاٹھ شالاؤں اور گوردواروں سے متعلق تھیں وہ بھی زیادہ تر مسجدوں ہی کے درس سے انسانیت حاصل فرماتی اور مسلمانوں کے علوم کی مدد سے ترقی کی راہوں سے گزرتی تھیں۔ یہ تعلیم تھی جو ذہنوں کو پاک باطنی سکھا کر آگے بڑھاتی تھی۔ اس تعلیم کو بدل

دنیا افرنگی صلیب کاروں کا سب سے بڑا حربہ تھا۔

اسکیم بنائی گئی۔ سرکاری ملازمت کو نصب العین ٹھہرایا گیا۔ رزق کی اور کوئی راہ کھُلی نہ رہنے دی گئی۔ ؎

آں کہ شیراں را کُند رُوبہ مزاج
احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

پرانی سرکاروں کے درباری اندر سے طبلِ تہی تھے۔ اُن کو غبارے بنا کر ہوس کی نئی ہوا بھری گئی۔ یہ خلاؤں میں اڑائے گئے۔ ان کی اس اُڑان کو آزاد خیالی بتایا گیا۔ یہ قوم و ملّت سے کٹے ہوئے پتنگ تھے۔ افرنگی کے ہاتھوں میں ان کی ڈور تھی۔ جس رُخ پر افرنگی چاہتے تھے اُس رُخ اُڑتے دکھائی دیتے تھے۔ ؎

یہ اُوپر کا طبقہ خلا ہی خلا ہے
ہَوا و ہَوَس کے غبارے چلا چل

قوم و ملّت سے کٹے ہُوئے یہ پتنگ ذاتی ہَوَس کی ہوائیں لہریں لیتے رہنے اور اپنی افرنگیانہ اولاد کو اپنے سے بھی زیادہ اس ڈور سے اُڑانے کی دُھن میں تھے۔ "تین القوم" والوں نے ذہنوں کو تکونی تُکلّیں بنا دیا تھا۔ میں نے اپنے شعر میں اُن کو غبارے کہا ہے ان میں اندر ہوا بھری ہوئی ہے۔ اے کاش یہ غبارے آزاد ہوتے۔ تا کہ کچھ مدّت خلا میں اپنی اُڑان دکھا کر غائب غلّہ ہو جاتے۔ لیکن صلیبی صنعت کاروں نے افرنگی مانجھے سے سُونتی ہوئی ڈوریں ان کی سلامتی کے لئے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی ہیں۔ بلندیوں پر رنگا رنگ کی تکلوں سے پیچ لڑوانے کا تماشا ہے۔ محض ذاتی ہَوَس کے لئے اُڑنے کی

تمنائیں ہیں۔ غیرت مند، بھاری بھرکم رہنے کی بجائے سُبک ہونے کا شوق ہے۔ اُولادوں کو بتایا جاتا رہا ہے کہ وہی لوگ بلند ہو سکتے ہیں جو انسانیت اور شرافت کے بوجھ سے آزاد ہوں۔

ع سُبک ہوتے ہیں چڑھ جاتے ہیں رُتبے کی بلندی پر
دَنا ئَتْ ان کو لے جاتی ہے بام ارجمندی پر

یہ سب کچھ مسجد سے گریز اور اسکولی تعلیم کے ذریعے کیا گیا ہے۔ یہ تعلیم خدائے واحد کی راہ بتانے والی مسجد سے وابستگی کو توڑ کر معاشی خستگی کا رشتہ صلیبی مقاصد سے جوڑنے کے لئے ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو عیسائی بنانا افرنگ کا مقصد نہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اُٹھتے بیٹھتے مسلمان کہتے رہیں بلکہ مسلمان ہونے کے نعرے بھی لگاتے ہوئے افرنگ کی بے دام غلامی کو بطیبِ خاطر سہتے رہیں۔ ان کے دلّال چھوٹے صاحب بڑے صاحب کامیاب ہیں کہ

تین خداؤں کی آسمانی بادشاہت کے لئے سرزمینِ فلسطین پر جن صلیبی جنگ جُوؤں کو شکست ہوئی تھی، اُن کی اَولاد ساری دُنیا کے مسلمانوں سے وہ بدلہ لے جس سے ساری دنیا کے شیطان انسانیت کی ذِلّت دیکھیں اور لذّت یاب ہنسیں، قہقہے لگائیں۔

یہ عمل پاکستان سے بہت پہلے سے جاری تھا۔ اَب ہماری رُوحوں میں اس کی عملداری ہے اور ہماری اولاد بھی اس کمینگی سے سنواری جا رہی ہے۔ مِلّت کے جن کٹے ہُوئے کنکوؤں کو تُکّل بنا کر اُڑایا گیا ان کی اَولاد کو نئی تہذیب کے تِلنگوں کی صُورت میں اَب سرزمینِ پاک پر افرنگ کے مانجھے

کی ڈور سپُردِ ہے۔ پیچ لڑ رہے ہیں۔ گلی کوچے میں تعلیم و تربیتِ مغربی کے لئے نمائشی معرکے پڑ رہے ہیں۔ اور اگر چند اہلِ نظر اس صورتِ حال اور تعلیم کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں تو یہ پُتلے اُن کو گلے سے پکڑ رہے ہیں۔

یہی پُتلے ہیں وہ کلیں جو "آٹومیٹک" چلتی ہیں۔ مسلسل، خود بخود کام کئے چلی جا رہی ہیں۔ فتنہ، اغوا، قتل وغیرہ کی خبریں، مذہب کے نام پر ہنگامے اور فسادات۔ یہ کیا ہیں۔ یہ ایک سکیم کے ماتحت افرنگ کی تعلیم کا ماحصل ہے نئی گھڑنت کے دل کہہ رہے ہیں کہ دین کو قطعاً تج دو۔ دینی تعلیم جس نے انسان کو اخوت اور مساوات سکھائی تھی۔ اب اس کی ضرورت کہیں نہیں ہے۔ اَب انفرادیت کا دَور ہے۔

انگریزی اسکولوں، کالجوں کے پڑھے ہوئے بھی اور ہم عام اَن پڑھ مسلمان بھی دینِ مُبین کے معاملے میں جاہل ہیں۔ روٹی کھانا ہی ہمارا دھندا ہے۔ ہم سے علانیہ کہا جا رہا ہے۔ اے مسلمان کہلاتے چلے جانے والو، دیکھو تمہارا مذہب ہیٹوں بیر رکھنے والوں کے سوا اور تو کچھ سکھاتا ہی نہیں۔

آؤ، اس سے آزاد ہو جاؤ۔ ہم تمہیں کارخانوں میں بھرتی کریں گے۔ تم کاریگر مزدور کہلاؤ گے، کماؤ کھاؤ گے۔ جو کچھ تمہاری کمائی ہوگی ہم تم سے لے کر تمہاری ہی مزید کمائی کے لئے باہر بھیجیں گے۔ جو چیزیں وہاں سے منگائیں گے اُن کو دکانوں میں سجاؤ، اپنے ہاں بھی یہ چیزیں اب رُوسی امریکی اُستادوں کی نگرانی میں چلاؤ۔ یہود و ہنود تمہارے وجود کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

تم مغربی قوموں کی طرح انہی کی طرز سے ساری دُنیا پر چھا جانے کے

فرسودہ خیالوں کو بے وقوفی گردانو۔ اصل آقاؤں کو مسلط رکھ کے مخالف ہواؤں کے مقابل ڈھور ڈنگروں کی طرح سامان مہیا کرنے والے بنے رہو ——،

اس طرح ان تکونی تکلّوں کی سرسراہٹ کی آوازوں سے ع

علانیہ خدا کے نام کی توہین ہوتی ہے
خودی کی خود پرستی کی بڑی تحسین ہوتی ہے

کا علاج؟ ہاں۔ محض ایک علاج، محض ایک علاج۔ وہ یہ کہ آؤ مسجد کی طرف۔ مسجد کو مرکز بنا کر تعلیم گاہیں کھولو۔

میں ہی نہیں اب۔ طوعاً یا کرہاً عوام میں نامور رہنے کے متمنّی کہہ رہے ہیں کہ یہ بنیادی اسکولی تعلیم ہے جو خرابیوں کا اصل باعث ہے۔

ہاں کہہ رہے ہیں لیکن تعلیم کے اسلوب کو بدلنے یا بدلوانے کے لئے کوئی بھی قدم ایسا نہیں اٹھایا جاتا جس پر عمارت بنیاد سے اس طرح اُٹھے جو ٹیڑھی نہ ہو ——،

ہمارے عام اسکول، پبلک اسکول، کانونٹ اسکول، مشنری اور دوسرے اسکول اور کالج نوجوانوں میں سے چُن چُن کر افرنگ کی صلاحیّت والوں سے بھرے جاتے ہیں۔ باقیوں کو دھتکار کے سوا کچھ نہیں مل رہا۔ یہ بہت عمدہ بات ہے۔ اس دھتکار سے سبق لو۔

مسجدیں سنسان پڑی ہیں آؤ ان کو آباد کریں — یاد رکھو۔ کسی بھی مسجد کا مُلّا ہو۔ بچّوں کو ابتدائی تعلیم دے سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم مسجد کے سوا مل ہی نہیں سکتی۔ اسلامی فضا مسجد ہی میں ہے اور یاد رکھئے کہ یہی فضا

اِسلام کی تعلیم کے لئے ایسی بنیاد ہے جس پر آئندہ اِسلامی معاشرہ کا ایوان قائم ہو سکتا ہے۔ ورنہ یہ چیخ دہاڑ، یہ کالم نویسی وغیرہ سب کچھ بے سُود — ،

ع آؤ رسمِ لَا اُحِبُّ الآفِلِین تازہ کریں
چشمِ ابراہیم سے ذوقِ یقیں تازہ کریں

آؤ سینے میں بسا لیں پھر مدینے کی بہار
دل میں حُبِّ رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِین تازہ کریں

اَب فرشتے آئینگے تنبیہہ کو

جو تلقینیں، تنبیہیں ہمیں مِل رہی ہیں۔ ہم اُن کو سُن کر بس تھوڑی دیر سَر ہلاتے یا چہ مگوئیاں کرتے ہیں۔ پھر تلقین و تنبیہہ کرنے والوں کو محض اپنی ہی طرح کے جھوٹے انسان سمجھتے ہوئے مسکرا دیتے ہیں۔ ہمارا حال کچھ ایسا ہے کہ

اُب ع آسماں سے کچھ فرشتے آئیں گے تعلیم کو ؟

کوئی عالم فاضل جو قرآن کریم کے اصل معانی آپ کو بتا سکے اُس سے پوچھئے وہ آپ کو بتا دے گا کہ قرآن کریم بھی اور تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ آسمان سے جب بھی غافل اور فاسق فاجر قوم کی تنبیہہ کے لئے فرشتے اُتارے جاتے ہیں تو جو حشر اس قوم کا ہوتا ہے وہ تا قیامت ہولناک سزا کا نشان بن جاتا ہے۔ لیکن قرآن تو ہم نے محض جھوٹی قسم کھانے ہی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ اگر میری بات آپ کو بُری لگی ہے جب بھی مجھ پر برس پڑنے سے پہلے میری نظم کا ایک شعر تو سُن لیجئے۔ اس نظم کا عنوان ہے: شہر پومپی آئی کی آخری رات: "پومپی آئی" کسی زمانے میں سب سے بڑی قوتِ رومن سلطنت کا دارالسلطنت اور دنیاوی فتوح کا مرکز تھا۔ ہو سکے تو اس ایک شعر سے اپنے

اب فرشتے آئیں گے تنبیہ کو

گھر کا، اپنی حویلی کا، اپنی عیش گاہ کا تصور کیجئے ؎

ستاروں کی نگاہوں نے دُھواں اُٹھتا ہوا دیکھا
مگر خورشید نے کچھ بھی نہ مٹی کے سوا دیکھا

اگر آپ اور میں — ہم سب، اب بھی نہیں سُنتے اور وہی ناچ ناچ رہے ہیں۔ جو مٹنے سے پہلے بدبخت قومیں ناچا کرتی ہیں تو ناچتے چلے جائیے۔ سینما، بائسکوپ میں غیر ملکی ہی نہیں اپنے ملک میں بنی ہوئی "زندہ ناچ گانے" کی پھدکتی اور رنگ رنگ کے انگ دکھاتی ہوئی زینتوں کی جسمانی بناوٹ اور کُتوں اور سوروں کو بھی شرمانے والی تصویریں ملاحظہ فرماتے ہوئے ناچئے۔ سینہ و بازو ہی پر نہیں، سُرین اور ساق سیمیں پر لٹو ہوتے جائیے۔ رقصاں کی جگمگاتی بھبھتی شمع آتشیں کے گرد پروانہ وار ناچئے۔ اس ناچ کو اسلامی ناچ قرار دے کر اپنی اسکولی اور کالجی بچیوں کو کھلے میدانوں، وسیع ایوانوں میں نچوائیے — اہاہا، واہ واہ کیجئے، تالیاں بجائیے۔ دلوں کو بہلائیے جسموں کو تپائیے۔ باز نہ آئیے، ناچتے جائیے ناچتے جائیے۔ کیونکہ ثواب حاصل کرنے کا یہ ناچ آپ اپنی قبروں پر ناچ رہے ہیں۔

کالجوں اور اسکولوں اور ثقافت گھروں میں اپنی ہی لڑکیوں کا ناچ کیسا سہانا ناچ ہے۔ اپنے لڑکوں کو اپنی ہی بہنوں کی عصمت لوٹنے کے گُر سکھاتے ہوئے ناچئے، ناچئے۔

بازاروں میں دوسروں کا حق مار کر بھرنے کے لئے اپنی تجوریاں ہر لمحہ گراں طلبی کے بھاؤ بتاتے ہوئے مجبوروں سے ان کے نوالے ہتھیاتے

ہوئے ناچیئے۔ بلکہ اپنے ہی جیسے بھائیوں کا گوشت اُتار کر قیمہ کیجئے کباب بنا کر اپنی ہی بچیوں کے خون کی شراب لنڈھاتے ہوئے ناچیئے۔

نہ سُنیئے کسی کی نہ سنئے۔ اُن مجاہدوں کو بھول جائیے جو دن رات آپ کی حفاظت کے لئے مشقت اور ریاضت میں لگے ہوئے ہیں۔ بھول جائیے ان شہیدوں کو بھی جن کا ثانی صحابہ کرام کے بعد تاریخ میں غازیانِ پاکستان کے سوا اور کہیں نہیں۔

سچ کہنے والے کی بات پر گالی دیجئے ـــــ تحسین کیجئے اُن کی جو فسادِ باہمی کی تعلیم دیتے ہیں۔ چُنتے جائیے فرقہ بازی کے کاغذی پھول چُنتے جائیے کیونکہ آپ کے لئے ان ہی کاغذی پھولوں میں ناچ نچوانے کا جادُو بھرا ہوا ہے۔ خبردار کرنے والے کسی بے وقوف کی نہ سنئے۔ ساتھ ہی خود اعلان بھی کرتے جائیے کہ بھارت کو ہم کچل دیں گے۔

کتنے ہم مسلمان پختہ ہیں۔ اِسلامی ناچ ناچتے ہیں۔ ان کی ریس ہم کیوں کریں جو ہمارے لئے رات دن مر رہے ہیں۔ جو ہیں اور ہمارے خاندانوں کو آنے والے دن سے بچانے کے لئے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ سر ہتھیلیوں پر لئے سرحدوں پر اِستادہ ہیں۔ ہوا پر متمکن ہیں سمندر کی لہروں پر چل رہے ہیں۔ اُن کی رِیس کریں وہ جو زندہ رہنا نہیں چاہتے اور وہ جو ایک رسولؐ ایک قرآن اور ایک ہی ایمان کے جھنڈے تلے متحد ہو جانے اور اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لئے بُلا رہے ـــ اُن کا گھیراؤ بھی نہیں، ان کو سرِ بازار مارئیے پیٹئے ـــ!

اب فرشتے آئیں گے تنبیہ کو

تم نے جہاد کی بات سُنی تو اتحاد کرنا ہو گا، حرام کو چھوڑ کر حلال کے لئے سر دُھننا پڑے گا. شیرانہ اور مردانہ لباس کے لئے ایمان دارانہ محنت و مشقت کا پسینہ بہنا پڑے گا.

ہاں آپ ریڈیو سنتے ہیں. بائیسکلوں پر چلتے ہوئے بھی. سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے جوتا گانٹھنے والے کے دہنے بائیں ہاتھ بیٹھ کر بھی امریکی، جاپانی، برطانی ٹرانزسٹر، موٹر کاروں، لاریوں اور بازاروں میں راہ باٹ میں بھی، کوٹھوں، ماڑیوں اور ہر قسم کی گاڑیوں میں بھی. آپ کی دُکانوں، جھونپڑیوں، کھوکھوں میں موسیقی گھر بنے ہوتے ہیں ——؛ جوان جہان دختروں ہی کو نہیں. کام کاج میں مصروف سن رسیدہ بہنوں کو بھی. ؎

ہاں ناچتی جا، گائے جا، جوشِ ہوس بھڑکائے جا

کی دُھنیں سُنتے رہنے اور پازیب کے بغیر پاؤں تھرکنے کی لذت بخش رہے ہیں.

ہے کسی کو ہوش، جس کے گوش میں سے دل تک یہ بات پہنچے کہ مشرقی پاکستان میں جو ہو رہا ہے اس کو نہ روکا تو مغربی پاکستان پر بھارت کا حملہ سر پر کھڑا ہے —— ،

یہ حملہ ہُوا تو ہم اپنے ذاتی مفاد اور تفرقہ بازی ہی کے نتائج کا ایسا ناخوشگوار تاریخی مزہ لیں گے جو آج تک ۱۴ صد سالہ تاریخِ ملت میں موجود نہیں.

اب فرشتے آئیں گے تنبیہ کو

سنئے نہ سنئے میں تو یہی کہہ رہا ہوں ۔ ؎

رقص فرماتی ہوئی مٹ جانے والی قوم کا
ایک جیتا جاگتا افسانہ جم خانے میں ہے

فرمائیے اب کتنے گھر ہیں جو جم خانے نہیں ہیں ——— !

جون ۱۹۶۹ء

پَتنگ، اور شاعری

آج بہتّر برس کی عمر ہو چکنے پر ابتدائی غزل طفلانہ پتنگ بازی کی سی اُمنگ نظر آتی ہے۔ سُخنوری کی فضائے بلند میں بہت سے مختلف رنگوں اور جسموں کے پتنگ پیرتے نظر آتے اور مجھے بھلے لگتے تھے۔

غزل کے اشعار۔ پتنگ۔ گُڈیاں۔ گُڈے اور تُکلّیں جن کا خلا میں تیَرنا جاذبِ چشم خیال تھا۔ میرا بھی جی چاہا مَیں بھی یہ پتنگ اُڑاؤں۔ مانجھا لگی ہوئی ڈور میرے ہاتھ میں بھی ہو۔ میرا پتنگ دوسروں سے بھی اُونچا اڑتا دکھائی دے ــــــ،

شعر کی پتنگ بازی سے پہلے مَیں کاغذی پتنگ، سازی اور بازی کی بھی اچھی خاصی مشق کر چکا تھا۔ کاغذ رنگ رنگ کے ڈھونڈ کر لاتا۔ بانس کی کھپچیاں قلم تراش سے کاٹتا چھانٹتا۔ آٹا پانی میں گھولتا، تھوڑا سا نیلا تھوتھا ملاتا۔ ململ کے رومال سے چھانتا۔ آگ پر پکاتا۔ نہایت عمدہ لئی بن جاتی۔ بانس کی کھپچیوں سے بنے ہوئے تیر کمان اس لئی سے کاغذ پر چپکاتا۔ سُکھاتا، کمان کے بازوؤں کو نہایت عمدگی سے کاغذ پر جماتا۔ پھر کمان اور تیر کے مقامِ اتّصال یعنی پتنگ

کی دھرن اور بیلنے کو ڈورے سے باندھ کر مساوی سطح پر رکھنے کے لئے تولتا، ڈور باندھتا۔ اپنی حویلی کی تیسری منزل پر کھڑا رہ کر پتنگ اُڑاتا۔ ــــ بارہا مار کھاتا ــ باز نہ آتا۔

دوسری پتنگوں سے پیچ بھی لڑتے۔ کبھی میرے پتنگ کی ڈور کٹتی، کبھی دوسروں کی۔ وہ کاٹا وہ کاٹا کا شور مچتا۔ بعض اوقات اپنے غلط جھکاؤ سے بھی پتنگ قابو میں نہ رہتے۔ کسی درخت یا عمارت سے ٹکرا جاتے، درختوں کی شاخوں میں پھنستے۔ لوٹنے والے لڑکے لڑتے جھگڑتے۔ چھینا جھپٹی میں پتنگ ہی کے ٹکڑے اُڑا دیتے۔

اُن دنوں کسی کے مُنہ سے سُنا تھا کہ پتنگ بلندیوں پر اُڑانا اور ہواؤں میں قائم رکھنا۔ پیچے لڑاکر فتح پانا بھی ایک فن ہے۔ پتنگ بازی کا شوق ہے تو کسی اُستاد پتنگ باز سے یہ فن سیکھنا ضروری ہے۔

کنکوے بنانے، بیچنے اور سکھانے والوں کو تو میں جانتا تھا۔ لیکن شعری کنکوے اُڑانے کا اُستاد جالندھر میں مجھے اُن دنوں تو کوئی نہ ملا۔ بات درست تھی۔ شعر بازی کے نئے پتنگ باز کو اُستاد کی ضرورت۔ تھی۔ مولانا محمد حسین کی "آبِ حیات" ہاتھ آئی۔ جس نے مجھے بہترین اُستادوں کے دروازوں پر گھماتے اور اُن کی اُڑانوں کو سمجھتے سمجھاتے میر تقی، میر درد، انشاء، ذوق مومن اور غالب کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ اُردو شاعری کے وہ باکمال پتنگ ساز و پتنگ باز ہیں کہ ان کی تکلیں پتنگیں اپنا اپنا جُدا رنگ روپ رکھتی ہیں اور فضاؤں میں مسلسل اُڑتی ہی رہتی ہیں۔

پتنگ اور شاعری

کتابوں میں بھی پتنگ گھروں میں بھی پتنگ سجے ہوئے موجود نظر آئے۔ کچھ لوگ ان میں سے اپنے اپنے مذاق کے اُٹھاتے، اُڑاتے اور پیچ بھی لڑاتے دیکھے۔ جی چاہا ان کا مقابلہ کروں ۔

مَیں نے اچھی اچھی مشہور دُکانیں بھی دیکھیں۔ دُکانوں یعنی کتابوں کتابوں میں سجی ہوئی اونچی اُڑان سے رفتہ رفتہ میرے ذوقِ نظر و قلب نے پتنگ بنانے اور بلندیوں پر قائم رکھنے کی کاریگری کا راز بھی پا لیا۔

اپنے ہی مطالعے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ شاعری کا شوق تو اسی طرح پیدائشی ہوتا ہے جیسے بچّے کو مختلف کھیلیں کھیلنے کی لگن۔ اس کھیل کی صلاحیّت بھی خداداد ہوتی ہے۔ لیکن یہ صلاحیت پرورش کے ساتھ ہی بڑھتی ہے۔ لیکن جس طرح کاغذی پتنگوں کے لئے کاغذ کاٹنے، تیر کمان بنانے کے اوزار اور جوڑنے کے مسالے اُستادوں ہی سے سیکھ لیں تو آسانی رہتی ہے۔ اسی طرح شاعری کا بھی معاملہ ہے۔ ہاں خود بھی کوئی نئی چیز اُن سے بہتر پیدا کر لی جائے تو کیا بات ہے۔

شاعری کے پتنگوں، کنکوؤں کے بنانے سنوارنے کے ان تمام مسالو یا دوسرے لفظوں میں صنایع بدائع، مصطلحات لوازماتِ شعر کو جان لینے اور مہیّا رکھنے کی ضرورت کے باوجود پتنگ اپنی طبع زاد ایجاد سے خود بخود عمدہ بنانا مشکل تو ہے لیکن محال ہرگز نہیں۔

اوزار کارخانوں میں ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ یہ ہیں وہ الفاظ مصطلحی ترکیبیں، تلازمے، صنایع بدائع وغیرہ تو مدّتوں کے بنے ہوئے چلے آرہے ہیں۔

لیکن پتنگ کی وضع قطع اور اسے اونچی سے اونچی اڑان پر لے جانا، قائم رکھنا یہ اپنی اندرونی ذات یعنی خداداد صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس صلاحیت کی پرورش بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے۔

مجھے چند برس استاد داغ سے بہتر پتنگیں بنانے کا شوق رہا۔ میں نے بنائیں اور اڑائیں بھی۔ واہ وا بھی ہوئی۔ لیکن گرامی صاحب نے روک دیا۔ کہ میاں اگر تم نے داغ کے رنگ کی داغ سے بہتر پتنگ بنا بھی لی اور اسے بلندیوں پر قائم بھی رکھا جب بھی یہ تمہارا کنکوا تو نہ ہوگا یہ تو داغ کا کمال گنا جائے گا۔ تم خود کیا ہو؟ میاں اگر یہ شوق پورا کرنا ہے تو قلب کو چیرو۔ اس میں سے جو نکلے اسی سے جیسی چاہو یا جیسی بن سکے بناؤ اور سجاؤ۔ شعر بازی میں دوسروں کی تقلید تو نقالی ہے۔ شاعری نہیں۔

میں نے استاد کی بات مان لی۔ اور اب تک اپنے قلب کو ہی نہیں چیر رہا۔ جگر کے خون سے اپنے پتنگ اڑانے کا مانجھا بنائے اور لگائے چلا جارہا ہوں۔ ڈور میری رگِ زندگی ہے — الیکن اب پیچے لڑانے کا شوق نہیں رہا۔

قدم کس رُخ پر؟

(محاسبہ)

بارہا مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے ہم پاکستان کے مسلمان کس رُخ پر چل رہے ہیں — کیا کر رہے ہیں۔؟

جب میں عرض کرتا ہوں کہ آپ خود متین اور صائب الرائے اصحاب ہیں۔ میں کبھی ایک معمولی شاعر تھا۔ اب وہ بھی نہیں۔ آپ مجھ سے کیوں یہ سوال کرتے ہیں، تو جواب ملتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران قوم کی یکجہتی، وحدت اور ایک دوسرے کی مدد۔ رشوت، قتل و غارت، زنا کا یک لخت بند ہو جانا، چوری اور رہزنی کی وارداتوں کا بہت بڑی حد تک فقدان اور اس فضا کا فخریہ اظہار آپ کی ان نظموں سے ہوا کرتا تھا جو آپ کی زبان سے ریڈیو پاکستان اور ریڈیو آزاد کشمیر پر سُنی جاتی تھیں —

پھر فرماتے ہیں: یہ نظمیات فوج ہی کو نہیں کروڑوں شہری مرد و زن کو بھی ایک جائز فخر کا احساس دلاتی تھیں۔

اس لئے اے حفیظ جالندھری شاعر، مصنف شاہنامۂ اسلام،

خالقِ ترانۂ پاکستان و ترانۂ کشمیر، ہمارے سوال کا جواب تجھے دینا ہوگا۔ ورنہ ــــــ ،

یہ ورنہ پر بات پہنچانے اور پوچھنے والے میرے نزدیک محض درد مند مسلمان ہی نہیں بلکہ قوم و ملت کی بھلائی کے لئے رات دن کار و پیکار میں لگے رہنے والے ہیں۔ اس لئے میں ان خطوط کا جواب لکھ رہا ہوں ــ ،

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہم مسلمانانِ پاکستان کیا کر رہے ہیں ؟ ــــــ جواب ہے کہ ــــ :

عیش کر رہے ہیں۔ موج میلا کر رہے ہیں۔ شہر ہوں یا دیہات افواج کی فتح مندی کو اپنی ہی بہادری، اپنی بے باکی قرار دے لینے والے "بلند ہمت" لوگ مسلمان بیٹیوں، بہنوں عورتوں کو زبردستی اغوا کرتے ہیں، چھرے دکھا کر اٹھاتے ہیں۔ ایک ایک کی عصمت کیو (Q) لگا کر لوٹتے ہیں۔ بھر پایا تو اسے کسی سڑک پر نیم مردہ پھینک دیتے ہیں۔ یا قتل فرما کر کنوئیں، دریا، یا گندے جوہڑ، یا نہر میں پھینک دیتے ہیں۔ زندہ رکھنا مطلوب ہو تو بیچ ڈالتے ہیں اور قیمت لے کر شرابیں پیتے پلاتے اور اپنے "قابلِ ستائش" کارنامے کے شغل کی مزید لیل و نہار کی تمہید میں لگ جاتے ہیں۔

مسلمان کارخانہ دار اپنی قوم کے ہر فرد کا خون۔ ہر چیز کی ناجائز ایک سو چھتر گنا زیادہ قیمت وصول کرنے کی ترکیب سے چوستے ہیں۔

ہر دکاندار جو انسانوں کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے بچھونے، پڑھنے لکھنے اور ضروریاتِ پیدائش و مرگ بیچتے ہیں چیز کی اصل قیمت پر جو نفع جی چاہتا ہے لگاتے ہیں۔ اور ضرورت مند کو بدزبانی کے جوہر دکھا کر دھونس کے ساتھ جو چاہیں وصول فرماتے ہیں

بلیک مارکیٹوں میں خفتہ و نہفتہ یافت مسلسل ترقی فرما رہی ہے۔،

علیٰ ہٰذا القیاس وہ ڈھلوان راہ جو قوموں کے ڈوبنے کی بالتعجیل دلیل و سبیل ہے۔ اس پر ذوق شوق اور جوش و خروش ہمیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے دوڑاتے لئے جا رہی ہے۔ ہمارا ہجوم رواں دواں ہے ایک دوسرے کو دھکیلتا پچھاڑتا روندتا ہوا اپنی مستعدی کا نشان دکھا رہا ہے۔

اچھا آپ کا ایک اور سوال بھی ہے۔۔ آپ پوچھتے ہیں:

کیا یہ خطرے سے بے خبری کا عالم ہے؟

جی نہیں ۔۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سرحد کے اُس پار آگ، گندھک، بجلی اور لوہے کا طوفان زمین اور آسمان پر سے پاکستان کے سر پر جھوم جھوم کر آ چکا ہے۔ تہ در تہ بادل ہر اُفق سے برسنے کے لئے رعد کی مانند گرج رہا ہے

۱۹۶۵ء کی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی کہ حملہ آوروں نے نئے ہتھیار استعمال کرنا آغاز کر لئے تھے۔ یہ ہتھیار دوبارہ حملہ کرنے سے پہلے ہم میں پھوٹ ڈالنے کی ہر طرح کی تفرقہ سازی کی پرانی برطانوی بازی تھی۔۔ چونکہ ہم ترقی پسندے

ہیں اَب اُن سے انعام لیتے ہوئے ہم خود تفرقہ پرور ہیں۔

پھوٹ ڈالنے کا ہتھیار ثقافت نامی ہے اور اسی ہتھیار کے ذریعے کامیاب ہو کر بھارت مہا بھارت کے مہا یدھ کا سنکھ بجا رہا ہے۔ اپنے مغربی امریکی روسی اور اسرائیلی اُستادوں سے نئی نئی دُھنیں واویلا کی سارنگی پر ساری دنیا کو ہم پر پل پڑنے کے لئے بجا رہا ہے۔ کالی دیوی کی پجارن بھجن الاپ رہی ہے۔ "سیکولر" گؤشالہ میں اللہ اکبر کہنے کے عادیوں نے توجے ہند کہتے ہوئے بُدھ بھجن گانے میں برہمن بھجنیکوں کو بھی شرما دیا ہے ـــ بھارت کے مُسلمان جے ہند الاپتے اور ہم کو بُرا بھلا کہتے ہوئے بھی ڈشٹ ہیں۔ اور خاک و خُون میں تڑپائے، جلائے اور جھٹکائے چلے جا رہے ہیں۔

جی ہاں، آپ کیا مَیں بھی آپ ہی کی مانند ہوں اور یہ سب کچھ دیکھ بھی رہا ہوں۔ ہندوؤں کو جاننے پہچاننے کی راہ و رسم اور رات کو رات دِن کو دِن پہچان لینے والی بصیرت سے دیکھ رہا ہوں۔ شاید آپ کو اس طرح دیکھنے کی ضرورت نہیں۔؟ اگر ضرورت ہے تو کیا دیکھتے نہیں کہ بھارت ماتا اپنے سورما بالکوں کی شکتی بڑھانے کے لئے اپنی کنیاؤں کو اپنے خوں خوار دانتوں سے چبانے کے لئے بھارت میں جے ہند پکارنے والے دُشٹ مُسلوں کا لہو پلا رہی ہے۔

ہمارے اخباروں میں تو قتلِ عام کا نام "فساد" رکھ کر ہزاروں سُنائیوں میں سے ایک آدھ خبر آتی ہے۔ یہ خبر فرانس یا کسی اور ملک میں پہنچ کر پاکستان بھی پہنچ جائے تو ہم سے چھپی نہیں رہتی۔ لیکن وہاں مسلمانوں کے خُون سے دھرتی ماتا جس طرح سیراب ہو رہی ہے اور مسلمانوں کی ہڈیوں سے جو کھاد بن رہی ہے

اس کا حال فرانسیسی یا انگریز یا امریکی یا روسی کیوں بتائیں۔ اُنہی کی مدد سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے ـــــ ۔

ہم ۱۹۶۵ء میں افواجِ پاکستان کی شیرانہ اور غازیانہ دلیری کو سراہتے ہیں جو ان مجاہدوں نے ہم غیر فوجیوں کے مال، ناموس اور جانیں بچا لینے کے لئے کی تھی۔ لیکن خود رات دن اپنی ہی بیٹیوں بہنوں کے ناموس اور ساری ملّت کے جان اور مال پر دست دراز ہیں۔

ہمارے اخبار بھی، ہمارے رہنما بھی اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمیں سب کچھ بتا رہے ہیں۔ لیکن ہم پہلے سے زیادہ بے حس ہونے کو مزے کی زندگی سمجھ رہے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اشتراکی روس ہی نہیں رجعت پسند سرمایہ دار قوتیں بھی بھارت پر جو کچھ صدقے کر رہی ہیں بھارت ماتا یہ سب کچھ اور اپنا دھن ہم پر دان کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔

روس، امریکہ، یوگوسلاویہ، اسرائیل وغیرہ وغیرہ سے زر بھی آرہا ہے، اناج بھی، ہتھیار بھی۔ اس دکشنا کو بھارت کے پنڈت بڑی طاقتوں یعنی مہا دیشوں کا دان پن کہتے ہیں۔ اب اس دان پن کی کھنکار کالی دیوی کی بھٹی میں پور پور پاکستان کی بھُن بھُن ہے۔

اخبار اپنی خبروں میں۔ پکارنے والے جلسوں میں، جلوسوں میں چیخ چلا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ان تحریروں ان تقریروں کو، اس پکار کو دیوانے کی بڑ یعنی ؏ شیر آیا، شیر آیا دوڑنا، کی بکواس سمجھ رہے ہیں۔ کیونکہ ہماری خود کشی ہمیں غور کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتی۔ تاکہ ذرا سوچیں

کہ اگر بھارت حملہ آور ہوا تو کیا ہوگا۔

پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ ذمّے دار اور پوری طرح باخبر افراد نے واشگاف اور صاف صاف الفاظ میں ہم کو اور ساری دُنیا کو بتا دیا ہے اور مسلسل بتا رہے ہیں، کہ پاکستان کے سر پر جنگ کا خطرہ منڈلا چکا ہے۔ ہمارے بہی خواہوں کو ہماری داد رسی کرنی چاہیئے۔ لیکن ہم افرادِ ملّت کروڑوں مُسلمان ملک و ملّت کو اس خطرے کے مقابل تیّار اور خبردار رہنے کی بجائے جو کچھ کر رہے ہیں شاید اسی کا نام مرنے کی زندگی ہے

ہمیں فرصت کہاں ہے۔ ہم تو دشمن کے آنے سے پہلے ہی اپنی ماں بہنوں کی عصمت دری کرنے کے ہُنر، لُوٹ اور قتل و غارت، اور گھرانے گھرانے فرد فرد کی تفریق میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ہمت سے ایسی تیاری کر رہے ہیں کہ دشمن آجائے تو ہم سب کو اپنی مرضی کے مطابق استقبال کے لئے خون و خاک میں رقصاں پائے۔

مل گئے آپ کو، مجھ نالائق سے، اپنے سوالوں کے جواب ــ اب تشریف لے جائیے۔ آرام فرمائیے ــ !

جی ہاں یہ انٹرویو تھا۔ میں جانتا ہوں، آپ اسے شائع کرنے سے باز رہیں گے۔ ———————— جون ۱۹۷۰ء

دُوری بھی حضُوری بھی،

۲۱؍اپریل (۱۹۷۴ء) کی رات۔ آفتاب ہمیں اندھیروں میں چھوڑ گیا تھا۔ کسی دوسری دُنیا پر طلوع ہو چکا ہوگا۔ اس وقت ہمارے آسمان پر بے شمار ستارے رقص و سرود کی محفل جمائے ہوئے ہیں۔ یہ سماں ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور نہیں بن سکتا ــــ میں یہ حروف لکھ رہا ہوں۔ شاید آفتاب میرے قلب میں اُتر آیا ہے۔

ستاروں کے رقص و سرود سے مسحور آنکھیں نور و سرور تو حاصل کرتی ہیں انہیں ننھّا مُنّا بھی کہتی ہیں، چمکارتی پچکارتی ہیں۔ مگر میرا احساس یہ ہے کہ ہماری ان طفلانہ باتوں پر ستارے مسکراتے ہیں۔ ان کے تبسّمی اشارے کہہ رہے ہیں "اے خاکی نگاہو، تم لاکھ چاہو ہماری بڑائی کا تصوّر تم سے ممکن نہیں۔ ٹھیک ہے تمہارے لئے ہم ننھّے منّے ہی بہتر ہیں۔

میں کہتا ہوں۔ بجا ہے، اے میری تنہا رات کی بہار و ستارو اے حسین مہ پارو۔ ہم بے چارے اِنسان ضَعِیفُ البُنیان تمہاری بلندی کی وجہ سے تمہاری اصل حقیقت سمجھنے سے ابھی تک عاجز ہی سہی

لیکن یہ تو ہم بھی جان چکے ہیں کہ تم سب کسی نہ کسی آفتاب ہی سے روشنی لیتے ہو۔ ہم پوچھتے ہیں فقط یہ کہ تمہاری روشنی سُلانے کے لئے کیوں ہے۔ جگانے کے لئے کیوں نہیں۔ تمہارا رقص و سرود نیند کی لوریاں کیوں دیتا ہے۔ آفتاب نے تو بیداری عطا کی تھی۔

برسوں گزر گئے ہماری دنیائے شعر و حکمت کا آفتابِ عالمتاب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ہاں برسوں گزر گئے اور ہماری دنیائے شعر و حکمت میں ابھی تک رات کی عملداری ہے۔

بے شک ہمارے آسمانِ شعر و حکمت پر بھی بے شمار ستارے ہیں۔ یہ سب ہمیں سرور عطا کرتے ہیں۔ ان میں بہت سوں کا دعویٰ ہے کہ اب اقبالؔ کی روشنی فقط ہم ہی ہیں۔

یہ جاننے کی مجھے تو قطعاً پروا نہیں کہ میں ذرّہ ہوں یا ستارہ۔ اِتنا جانتا ہوں کہ روشنی کی جو چند کرنیں مجھ تک میرے ظرف کو ملحوظ رکھتے ہوتے آئی ہیں وہ بنات النعش سے نہیں بلکہ براہ راست اُسی نیرِّ اعظم سے مَیں نے اخذ کی ہیں۔ جس کا نام اقبالؔ ہے۔

سَب سے پہلے ایک گزارش لازمی یہ ہے کہ اقبالؔ کے رخصت ہو جانے کے بعد بہت سے ایسے لوگ دعوے کر رہے ہیں کہ وہ علامہ اقبالؔ کے بے تکلف دوست تھے اور ایک دو نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ خیال ہم دیتے تھے شعر اقبالؔ کہہ دیتا تھا۔ مجھے اعتراف یہ کرنا ہے کہ مَیں نہ تو اقبالؔ کے حلقہ

احباب میں شامل تھا۔ اور نہ مجھے مُریدانِ خاص الخاص میں شمار ہونے کا کسی بھی رنگ ڈھنگ سے دعوٰے ہے۔ البتہ میں باریاب تھا۔ اور وہ مجھ پر مہربان تھے اس مہروکرم کا سبب میرا نیازمندانہ خاموشس انداز تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ مَیں حضرت مولانا گرامیؔ کا شاگرد تھا۔ اور گرامیؔ مرحوم اور علامہ اقبالؔ میں نہ صرف گہری دوستی تھی بلکہ ایک اور رشتہ بھی تھا۔ یعنی اقبالؔ مرحوم اپنے فارسی کلام کی زبان اور محاورے کے بارے میں حضرت گرامیؔ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس خط وکتابت کا بہت سا حصّہ میری نظر سے گزرتا رہتا، جو گرامیؔ اور علامہ اقبالؔ میں ہُوا کرتی تھی۔ بلکہ مَیں لاہور آکر گرامیؔ کے خطوط بھی پہنچایا کرتا —— بسا اوقات جوابات بھی لے جایا کرتا تھا۔ گرامیؔ اور اقبالؔ کی دوستی کا دَور بے شمار لطائف وظرائف اور نکات کا حامل ہے۔ انشاء اللہ میں اسے صفحۂ قرطاس پر لے آؤں گا۔

یہاں تو محض وہ تاثرات بیان کرنا ہیں جو بعض یادگار واقعات ہیں میری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے میری طفلی کا لطیفہ ہے۔ مَیں آٹھ نَو برس کا لڑکا تھا۔ جب مَیں نے پہلے پہل ایک نظم تیا شوالہ سُنی۔ پڑھی اور یاد کرلی۔ پھر اپنے ایک ہم مکتب برہمن زادے کو سُنانے لگا۔ :

تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

صنم کا لفظ بُت کے معنوں میں مولود شریف کی تقریروں میں وعظ کرنے والے واعظوں سے سُن رکھا تھا لیکن صنم کدوں کی ترکیب اُن دِنوں میری

میری سمجھ سے بالا تھی. جالندھری دوآبی پنجابی زبان میں "کددں" کے معنی ہیں "کب" اور اس کو ماضی کے لئے استعمال کریں تو کہیں گے، "کددں دے". یہ واقعہ میرے بیتتے ہوئے ابتدائی دِنوں کا ہے اُن دِنوں اِس شعر کا جو مفہوم میرے ذہن میں تھا ایک لطیفے سے کم نہیں.

سچ کہہ دوں اَے بَرَہمن گَر تُو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

مَیں اپنے بُرَہمن زاد ہمجولی کو یہ شعر سُناتا اور معنی بھی بیان کرتا جاتا، کہ اے برہمن اگر تُو بُرا نہ مانے تو میں ایک سچّی بات کہہ دوں.......
دیکھنا بُرا نہ ماننا سچی بات یہ ہے کہ تیرے ناز نخرے جو تُو اپنے گلی کُوچے میں دِکھاتا پھرتا ہے سب بُت ہیں جو مدّت ہوئی پرانے (آوٹ آف ڈیٹ) ہو چکے ہیں. اِن کا مجھ پر کوئی اَثر نہیں ہو سکتا.

مزا یہ کہ وہ برہمن زادے صاحب شرما جاتے اور چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی —— وہ زمانہ گزر گیا اور مَیں خود شاعری فرمانے لگا. لیکن بچپن کی اس شرارتی جہالت کے مزے تو اب تک لیتا ہوں. ہر برہمن کو تیرے بُت ہو گئے پرانے. کہنے والا مجھے بھی یہی کہنے کا حوصلہ دے رہا ہے —

علاّمہ اقبالؔ کو پہلی مرتبہ مَیں نے ایک بہت بڑے مشاعرے میں دیکھا. جہاں مَیں خود بھی شعر پڑھنے کے لئے جالندھر سے بلایا گیا تھا. اگرچہ مَیں اس روز کی عمومی ذلّت سے شعر نہ پڑھنے کے سبب بچ گیا تھا. میری عمر سولہ برس سے زیادہ نہ تھی. مجھے پنجابی کا بھی. اُردو کا بھی اچھا شاعر بتایا جاتا تھا —— !

کہاں۔؟ جالندھر میں ارد گرد کی بستیوں اور کپور تھلہ، نکودر وغیرہ میں بھی۔

—— جس مشاعرے کا مَیں ذکر کرنے والا ہوں وہ مشاعرہ اوّلین جنگِ عالمگیر کے آخری دَور میں پنجاب پبلسٹی کمیٹی کی طرف سے منعقد ہُوا تھا۔ ڈیڑھ دو ہزار شاعر اور ساٹھ ستر ہزار سُننے والے شمالی ہندوستان کے سب سے بڑے اور وسیع (بریڈلا) ہال لاہور میں جمع تھے۔

فضا کچھ ایسی تھی کہ جس شاعر نے بھی سٹیج پر آکر لوگوں کے چشم و گوش پہ حملہ آوَر ہونے کی جُرأت کی لاہور کے کالجی جوانوں کی متحدہ فوج کی بپھری ہوئی مَوج نے اس شاعر کو پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بعض لوگ بڑے دعوے سے "منم منم" کرتے ہوئے اُٹھے لیکن داد میں بڑی ندامت ملی۔ بعض خود بیٹھ گئے بعض بٹھا دیئے گئے۔

مَیں تو خیر تھا ہی نو مشق۔ یہ حال دیکھ کر بڑے بڑے گھاگ بغلیں جھانکتے دیکھے گئے۔ سٹیج پر جانے سے انکار کرنے لگے۔ پولیس بلائی گئی۔ سامنے ڈھنی بنچوں پر اور گیلریوں میں ٹھُنسے ہوئے ہندو، مسلمان، سکھ کالجی جوانوں پر ڈنڈا برسا۔ لیکن شاعروں کی فوج کو شکست کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہُوا۔ نوجوان طالبانِ علم نے ہر شاعر کے چہرے پر انڈا یعنی صِفر برسا دیا۔

پولیس ایکشن کے سبب پُوری لَے کیساتھ بجتی ہوئی تالیاں اور اجتماعی سیٹیاں تو ذرا چُپ سادھ گئیں۔ لیکن ستر ہزار بھینچے ہوئے دانتوں اور نیم وا ہونٹوں سے ایسی شوُں شوُں اُوں اُوں کی صدائے بازگشت سے اِس وسیع ہال کی فضا بھر گئی جیسے آبشار گر رہے ہیں یا بہشتیوں نے بیک وقت پانی کی بھری

ہوئی لاکھوں مُشکوں کے منہ کھول دیتے ہیں۔ جس شاعر نے بھی سَر اُٹھانے کی جسارت کی۔ اس پر ہزاروں گھڑے پانی پڑنے لگا۔ واضح رہے کہ یہ مشاعرہ امرتسر کے جلیانوالے باغ میں قتلِ عام اور اوڈوائر کے نافذ کردہ مارشل لاء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مشاعرے کے آغاز میں تھیٹر کے گویوں کی ایک پارٹی سے ہارمونیم پر طبلہ پیٹنے کے ساتھ۔ ع

یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا

گوایا گیا تھا۔

(مشہور بدنام) سر مائیکل اوڈوائر صوبہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر صدارت فرمارہے تھے۔ حکیم احمد شجاع صاحب سرکاری اخبار "حق" کے اڈیٹر اور مشہور و معروف شاعر و صاحبِ قلم مشاعرہ میں شاعروں کو سٹیج پر بُلانے اور سامعین کو مختلف طریق سے خاموش کرانے کی ناکامی کا شکار تھے۔

آخر نوابؔ سراج الدین سائلؔ جیسے خوش قامت اور خوش الحان کو لایا اور بٹھایا گیا۔ لیکن ان کی وجاہت کام نہ آئی۔ گھمبیر سردں کی آواز۔ مرحوم نے انگریزوں کو اپنا اَن داتا کہہ کر لوگوں کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ ان کے سر کی لوہاروی کلاہ شوں شوں کے ساتھ، تالیوں، کاغذ کے بنے ہوئے پٹاخوں کی دھمک سے اور سیٹیوں کے بے زبان طوفان سے اُتر گئی۔

بات یہ تھی کہ اس جنگِ عالمگیر میں اس برصغیر میں بسنے والوں کو فقط انگریزوں کی شکست ہی منظور نہ تھی۔ بلکہ علانیہ انگریز کے خلاف نعرے لگانا شعار بن چکا تھا۔

مشاعرے کی یہ مضحکہ خیز حالت تھی کہ ڈاکٹر اقبالؔ کے نام کا اعلان کیا گیا۔۔۔ لیجئے ڈاکٹر اقبالؔ اپنا کلام سنائیں گے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ تمام زبانیں، تمام شور شر، تمام تالیاں، تمام سیٹیاں یکایک چُپ سادھ گئیں۔ وہ جو فرش پر جُوتوں کی پھٹ پھٹ تھی۔ وہ جو بچوں پر پنسلوں کی کھٹ کھٹاک تھی، سب دم بخود۔ پانی کی سب مشکوں کے مُنہ بند۔

یہ تھا علامہ اقبالؔ کا میری آنکھوں سے پہلی مرتبہ کا دیدار۔ ایک مضبوط، وجیہہ، ادھیڑ عمر کا فرد۔ ترکی ٹوپی اوڑھے وقار کے ساتھ سٹیج پر آیا۔ اُس نے فارسی زبان میں ایک نظم ترنّم کے ساتھ سنائی۔ یہ تھا اس کا حوصلہ اور اعتمادِ ذات عین اُس وقت جب ستر ہزار میں زیادہ سامعین سکھ پنجابی کے رسیا، ہندو ہندی کے طالب اُردو تک کے دشمن وہاں فارسی کی نظم!

یہ نظم سب نے سُنی۔ فارسی نہ جاننے والے بے شمار تھے۔ جاننے والے چند سینکڑوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ لیکن جب وہ نظم سُنا کر بیٹھا۔ تو تحسین کی تالیوں سے ہال ہی نہیں زمین و آسمان مشوُر ہو گئے۔۔۔ آج مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہم سب جو ہجوم اندر ہجوم شاعر ہیں ان میں اصل شاعر کون ہے۔۔۔! الحمدللہ اتنی فارسی تو میں بھی جانتا تھا۔ جس نے مجھے بتا دیا اور میں سمجھ گیا کہ اقبالؔ کیا ہے کیوں سب سے بلند ہے۔

دوسری مرتبہ اقبالؔ کو میں نے (امرتسر) مُسلم لیگ کے اس جلسے میں شعر سناتے سُنا۔ جہاں مولانا محمد علی اور شوکت علی قید سے رہا ہو کر امرتسر

آئے تھے۔ یہ وہ پُر آشوب دَور تھا جب غلاموں نے آزادی کی پہلی کروٹ لی تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ کانگریس اور مُسلم لیگ نے اتحاد کر لیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے ہنگامہ خیز اجلاس ہو رہے تھے۔ میں جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے دو دن پہلے جالندھر کے ایک پراونشل کانگریس کے جلسے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے اصرار دایا۔ پر ایک نظم سنانے کے جرم میں قید کاٹ چکا تھا اور اب باغی شاعر بن رہا تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس اس تھیئٹر ہال میں تھا جو اَمرتسر کے مسلم ہائی سکول کے عین قریب تھا۔ اور جہاں میں کبھی کبھی جالندھر سے بھاگ بھاگ کر تھیٹر دیکھنے جایا کرتا۔

آج اسی ہال میں جالندھر سے اپنے چند دوستوں کے ساتھ امرتسر میں وارد اور دُور گیلری میں ٹھنسا ہُوا جلسے کا نگران

علامہ نے چند شعر فارسی میں پڑھے۔ عنوان تھا "فلسفہ اسیری"۔ یہ آواز آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ سُریلی آواز، دل میں اُتر جانے والا ترنّم۔

جلسہ ختم ہُوا۔ اقبالؔ بہت سے آدمیوں کے جھرمٹ میں جلسہ گاہ سے نکل رہے تھے۔ ہجوم میں گھُس پل کر میں نے ان کا محض ہاتھ ہی نہیں جکڑ لیا بلکہ لپٹ بھی گیا جیسے بچھڑا ہوا کوئی بیٹا اپنے باپ کو لپٹا لے۔ علاّمہ کچھ بولے نہیں۔ میری صورت دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ میں واقعی وارفتہ سا تھا۔ ان کے ارد گرد کا ایک ہجوم۔ میں پتلا دُبلا سُوکھا سا کھا

کم حیثیت سا لڑکا۔ میری اس حرکت سے ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چلنے والا ایک سیلاب، رُک گیا تھا۔

مجھے اُس وقت ہوش آیا جب بازو سے پکڑ کر کسی نے مجھے دھکیل دیا۔ آواز آئی "اوتے ہُن بس وی کر (ابے ختم بھی کر)

دیکھا تو ایک کالا بھجنگ دیو، طرّے دار پگڑی باندھے میرے اور علاّمہ کے درمیان حائل ہے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ چوہدری شہاب الدین (مرحوم) تھے۔ جو اُن دنوں علاّمہ کے مریدانِ خاص میں گِنے جاتے تھے۔ بعد میں یہ بھی جان لیا کہ وہ شاعر بھی تھے۔ میری قسمت میں یہ بھی لکھّا تھا کہ پہلی مرتبہ اقبال کے قُرب سے ان کے ہاتھوں دھکیلا جاؤں۔ اور دوسری مرتبہ اپنی تصنیف کردہ "سوز و ساز"۔ اردو شعر کی وہ کتاب جس کو پنجاب ٹیکسٹ بُک کمیٹی نے اپنی تشکیل میں پہلی مرتبہ نثر کی کتابوں کے ہوتے ہوئے اول درجے کا انعام تجویز کیا۔ اس کا انعام چودھری صاحب بھی نصفا نصف بٹور لیں۔ کیونکہ انھوں نے مُسدّسِ حالی کا پنجابی ترجمہ کیا تھا۔ اور لاہور کی میونسپل کمیٹی کے صدرِ اعظم بھی تھے۔

مَیں نے اس دَور میں حضرت گرامی کی جُوتیاں سیدھی کرنا شروع کی تھیں۔ گھر سے بھاگ دوڑ دَوڑ کے زمانے میں لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں مطالعہ کے مزے لینے آتا رہتا تھا۔ گرامی صاحب مجھے اقبال کے نام خطوط دے دیتے مَیں پہنچا دیتا۔ لیکن خود اپنی شعر شاعری کا تذکرہ زبان پر نہ لاتا۔ مجھے ہمیشہ اپنی اس جرأتِ والہانہ اور چودھری صاحب کے دخل در معقولات

کا دل ہی میں شکوہ بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی میری وہ بے ہنگم عقیدت اور طرز آداب اور چودھری صاحب کا جوابِ باصواب یاد تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فرما دیتے "آؤ حفیظ جی آؤ بیٹھو"۔ یہاں چودھری صاحب نہیں ہیں۔ اور پھر چھوٹا سا قہقہہ لگا دیا کرتے۔

میری اوّلین شاعرانہ جسارتِ ملاقات ڈاکٹر صاحب سے ۱۹۲۱ء میں ہوئی جب میری عمر ۲۱ برس تھی۔ جالندھر سے ایک رسالہ "اعجاز" نامی نکالنے کا ارادہ کیا۔ ملک الشعراء گرامی اس رسالے کے سرپرست تھے۔ پہلے نمبر کے لئے مجھے علامہ اقبال کے اشعار کی تمنّا تھی۔ حضرت گرامی نے ایک چھٹّی دی ہیں لاہور پہنچا عصر کے بعد کا وقت تھا۔ آپ انار کلی کے ایک بالاخانہ میں متمکن تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوا تو علامہ کا خاص خادم علی بخش، خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ گرامی صاحب کے چھٹی رساں کو دیکھ کر علی بخش ہمیشہ پھول کی طرح کھل جایا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب دوسرے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو مولینا گرامی کا خط دیا۔ جب تک وہ پڑھتے رہے مَیں کھڑا اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ اس خط میں حضرت گرامی نے میری تعریف کے پُل باندھ رکھے تھے۔ مجھے آسمانِ اَدب پر چمکنے والا روشن ستارہ بتایا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو مجھ پر ہمیشہ مہربان رہنے کی تاکید کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا :

حفیظ جی بیٹھ جاؤ۔ علی بخش چا لیا۔ — چائے کی یہ اوّلین پیالی تھی جسے

مَیں حجابِ آداب کے سبب خالی بھی نہ کر سکا۔

پہلے آپ نے مجھ سے گرامی صاحب کی صحت، اُن کے لاہور آنے کے ارادے پوچھے۔ پھر دوبارہ خط پر نظر ڈالی اور میری تعلیم دریافت کی۔

مَیں ندامت کے کنوئیں میں گر گیا۔ میرے مُنہ سے نِکلا: "ساتویں جماعت" پاس کہنا بھی بھُول گیا۔ اَدبی رسالے کا ایڈیٹر بننے کو حکیم الاُمّت اور اِس دُنیا میں سب سے بڑے عالم اور شاعر اقبالؔ سے اشعار طلب کرتے وقت اپنی حیثیتِ علم بیان کرنے کے دوران اسکول سے بھگوڑے کا جو حال ہو سکتا ہے اس کا اندازہ آپ فرما سکیں تو فرمائیے۔

علاّمہ کی نگاہوں میں حقارت کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ فرمایا۔ مطالعہ جاری رکھو۔

پھر پوچھا۔ تم فارسی میں شعر کہتے ہو یا اُردو میں۔؟

میں نے عرض کیا۔ اُردو میں۔

فرمایا۔ بہت اچھی بات ہے۔ ایک بات یاد رکھو۔ اپنے اشعار میں پرانی طرز کے رونے دھونے کی تبلیغ سے باز رہنا۔ رونا رُلانا بہت ہو چکا ہے۔ لوگوں کو ہمّت اور حوصلہ درکار ہے

اَب مَیں نے اپنے رسالے "اعجاز" کے لئے علاّمہ سے اشعار کی درخواست کی۔ آپ نے بکمال مہربانی مجھے پانچ شعر فارسی کے لکھوائے جن میں سے دو مجھے اس تحریر کے وقت بھی یاد ہیں۔

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دِگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ، ہنگامۂ چنگیزے

حرفِ نہ گفتۂ شما بر لبِ کودکاں رسید
از منِ بے زباں بگو پردگیانِ ساز را

گرامی صاحب کا نام لے کر رسالے کے لئے کبھی کبھی قلمی امداد کی میری درخواست کے جواب میں جو کچھ کہا میرے سینے پر لکھا ہے۔ فرمایا :
جس طرح کوئی زمین بہت زیادہ کاشت ہوتی رہنے
سے بنجر سی ہو جاتی ہے اس کو کچھ عرصہ کے لئے بغیر
کاشت چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ زمین کی خداداد صلاحیت اپنا مقام حاصل کرلے۔
آج کل یہی میرا حال ہے۔ میں بہت کم لکھتا رہا ہوں۔

آج میں علامہ کے اس عُذر کو خود اپنی ذات پر مُسلّط دیکھتا ہی نہیں بلکہ اس عُذر پر خود بخود آنسو بھی بہاتا ہوں۔
مختصر یہ کہ نمازِ مغرب سے پہلے آپ نے مجھے گرامی صاحبؒ کے نام ایک خط دیا۔ میں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ یہ ملاقات مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ رسالہ تو پانچ ماہ بعد بند ہو گیا۔ میں کشمیر چل دیا۔ پلٹا تو میں نے ایک مکان فروخت کر دیا۔ جس کی پاداش میں میرے والد نے جُوتوں سے میرا دماغ پختہ کیا اور گھر سے نکال دیا کہ جاؤ شاعری ہی کرو۔

لہٰذا مَیں جالندھر چھوڑ کر لاہور آگیا۔ یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے ـــــ
لاہور میں میری شعر شاعری نے ہنگامے برپا کر دیئے۔ حاضری کا شوق مجھے شیخ صاحب سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال کے حضور سلام کے لیئے لے جاتا رہا۔ اور یہی میرے لیئے آج تک کا زادِ سفر تھا۔

علامہ کے پاس اکثر احباب خاص ہی جمع ہوتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار مجھے تنہائی کی حضوری بھی نصیب ہو جاتی۔ علامہ حُقہ پیتے جاتے، دریائے فکر و نظر بہتا رہتا ـــ اقبال جس کو بھی جوہرِ قابل سمجھتے اسی طرح اس کی ذہنی پرورش فرماتے تھے۔

مَیں ان سے کوئی سوال شاذ ہی کرتا۔ خاموش بیٹھا سُنتا رہتا اور جو کچھ اور جتنا کچھ میری سمجھ میں آتا اُسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا۔

آپ نے دو ایک مرتبہ نہ جانے کیوں مجھ سے شعر سُنانے کی فرمائش کی۔ لیکن الحمدللہ مجھ سے یہ حماقت سرزد نہ ہوئی۔ سچ ہے میں اُن دنوں پنجاب ہی کا نہیں پورے برّ ِ اعظم کا گاماں پہلوانِ سُخن تھا لیکن اُن کے سامنے شاعر بننا اور شعر سُنانا مجھے تو بیہودگی ہی نظر آتی تھی۔

ایک مرتبہ مَیں، سالک صاحب، مرتضیٰ میکش اور ایک اور شاعر دوست جن کا نام لینا اب مناسب نہیں علامہ کے ہاں جا بیٹھے۔ علامہ نے ہم سب سے شعر سُنانے کی فرمائش کی۔ مَیں اور سالک صاحب تو کنی کاٹ گئے مگر ہمارے ساتھی نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک کالی سی جیبی بیاض نکالی ایک غزل جو حضرت علامہ ہی کی غزل کے جواب میں

لکھی گئی تھی۔ سنانی شروع کر دی ہیں اور سالک اور مکیش ہکے بکے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے میرے اس شیر نے پوری غزل کے ہر شعر کو مکرر سہ کرر بھی پڑھا۔ اور داد بھی طلب فرمائی۔

علامہ خوب خوب فرماتے اور حقہ پیتے رہے۔ آخر شاعر صاحب نے مقطع کے بعد مطلع پھر سنا ڈالا اور کالی کتاب جیب میں ڈال لی، تو ان کو تخلص سے مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا :-

" صاحب آپ نے تو بڑے زور کی غزل لکھی ہے۔ اہل زبان سنیں گے تو بہت داد دیں گے کہیں گے آپ نے سیر قوالی غزل ارشاد کی ہے۔"

ہم اپنے دوست کی حماقت پر پانی پانی ہو رہے تھے۔ اب وہاں سے جو پلٹے تو راہ میں سالک صاحب اور مکیش نے ان کے لتے لینے چاہے لیکن وہ صاحب بحث پر اتر آئے۔

میں نے علامہ کی موجودگی میں انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے عظیم الشان جلسوں میں شعر تو پڑھے ہیں، چندہ بھی جمع کرایا ہے۔ لیکن ان کے درِ دولت پر جا کر شعر تو کیا شاعری کے متعلق کچھ پوچھنے کی بھی جسارت نہ ہو سکی۔ ان کو شعر سنانے کے چند ہی واقعے میری جسارت کی یادگار ہیں۔

پہلی صورت یہ ہوئی کہ میں نے ایک نظم " تین نغمے " (ٹیگور، اقبال اور حفیظ) لکھی تھی۔ سب سے پہلے فارمن کرسچن کالج کے ایک بہت بڑے جلسے میں سنائی بعد ازاں یہ نظم ہر جگہ سنی جانے لگی تھی۔

سر راس مسعود (مرحوم) نے جو علامہ کے دالہ و شیدا تھے علی گڑھ اور

کانپور کی اُردو کانفرنسوں میں اور عظیم مشاعروں اور جلسوں میں مجھ سے یہ نظم سُن سُن کر اس کی نقل بھی مجھ سے لے رکھی تھی۔

ایک دن میں اپنے ٹھکانے پر ماڈل ٹاؤن میں تھا کہ سر راس مسعود جو کسی کام کے لئے لاہور آئے تھے۔ موٹر کار میں میرے غریب خانے پر آ پہنچے۔ میں اس وقت "سوز و ساز" کی کتابت کی اصلاح کر رہا تھا۔ کھڑے کھڑے مجھ سے کہا۔ نظم "تین نغمے" لو اور میرے ساتھ موٹر میں سوار ہو جاؤ۔

میں نے کہا حضرت ذرا میرے غریب خانے کو زینت بخشئے۔

جواب ملا: نہیں۔ آج تمہیں گرفتار کرنے ہی کو آیا ہوں۔

خیر میں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ سمجھا مجھے سر شفیع کے ہاں لے جائیں گے کتابت شدہ نظم لپیٹی اور ساتھ ہو لیا۔ لاہور پہنچے، دیکھا کہ وہ سیدھے میکلوڈ روڈ، علامہ کے مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اب حجت اور حیلہ بے معنی تھا۔ سہما ہوا برآمدے میں داخل ہوا۔ علی بخش نے کرسیاں آگے بڑھائیں۔ سر راس مسعود بیٹھ گئے میں کھڑا رہا۔ سر راس مسعود نے علامہ اقبال سے کہا:

لیجئے، آپ کے ایک بڑے مجرم کو پکڑ لایا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ وہ ہنسے اور پنجابی میں فرمایا: آؤ جی حفیظ جی، ایہہ تاں بہت بُرے ہتھ پھسے او۔ (یہ تو بہت بُرے ہاتھ پھنس گئے ہو)

جواب دیئے بغیر میں گُم سُم بیٹھ گیا۔ خلافِ معمول آج خود ہی اپنے حُقّے

کی نَے میری طرف پھیر دی۔

بھلا سر راس کو تاب کہاں۔ اقبال! تم میرے بیٹے کا مزاج خراب کر دو گے۔ پھر میری طرف مخاطب ہوئے۔

"پہلے وہ نظم سناؤ، تمہارے جُرم کی سزا بل جائے تو حُقّہ بھی گُڑگُڑا لینا۔"

سید سر راس مسعود کی طرف سے یہ انتہائی قدر افزائی تھی۔ لیکن میرے حواس غائب تھے۔ مَیں نے عرض کیا۔ "مجھ سے ڈاکٹر صاحب کے سامنے شعر پڑھا نہیں جاتا۔" سید راس مسعود نے کہا، "منہ میری طرف کرلو۔ سمجھ لو کہ تم علی گڑھ میں ہو۔ جس طرح وہاں سب کو تڑپاتے اور مجھے رُلاتے رہے ہو، ہمارا اقبال بھی تو جان لے۔"

یہ مرگِ مفاجات کی صورت تھی۔ نظم سُنانی ہی پڑی۔ مجھے یاد ہے مَیں نے خود بھی اس سے پہلے کبھی ایسا لطف اس نظم سے نہیں لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب حُقّہ پیتے رہے نظم سُنتے رہے۔ بعض شعروں کو دوبارہ بھی پڑھوایا۔ جب تک میں ٹیگور کی خواب آور شاعری کا حُسن اور اس کا اثر اپنی ذات پر بیان کرتا رہا وہ بار بار بہت خوب کہتے رہے۔

پھر جہاں مَیں نے اقبال کی شاعری کو ایک تلاطم خیز دریا کہا اور ٹیگور کی پُر بہار نہر یا ندی کو چھوڑ کر اس دریا کے کنارے کنارے ڈگمگاتے ہوئے چلنے کے شعر سنائے تو علامہ میری طرف حیرت اور غور سے دیکھنے لگے۔

جب یہ شعر آیا کہ ؎

درد کی چیخیں اُٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آبِ دیدہ ہو گیا دریا مری آواز سے

تو مکرر پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دیکھا سید راس مسعود ہی کی نہیں علامہ اقبالؔ کی آنکھیں بھی پُرنم تھیں۔ یہ شعر کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد میں نے یہ شعر سُنایا ؎

میرا نغمہ نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا

تو ڈاکٹر صاحب کے مُنہ سے بے اختیار نکلا :

"ہم آہنگ بھی ہم آہنگ بھی ــــ بلند آواز، بلند آواز۔ بہت خُوب"

نظم ختم ہوئی تو سید راس مسعود نے مجھے بغل گیر کر لیا۔ میرا ماتھا چُوما کہا : دیکھا اقبالؔ، میرا بیٹا، اللہ نے حالیؔ کا بدل ہمیں عنایت کر دیا ہے۔"

آج یہ الفاظ لکھتے ہوئے اے کاش سر راس مسعود ہی میرے تلخ آنسوؤں کو دیکھ سکتے۔

مجھے اس تقریبِ سعید پر ناز کیوں نہ ہو، میں عُمر بھر اس کو بھول نہیں سکتا۔ ہاں میں بھول نہیں سکتا کہ ایک نظم تو کم از کم میں نے زندگی میں ایسی بھی لکھی ہے جس کو اقبالؔ نے نہ فقط سنا نہ فقط پسند کیا بلکہ متاثر بھی ہوئے اور بقول تاثیر اپنی ایک نظم میں میری بندش کے الفاظ بھی استعمال کیے۔ (تن تیرا نہ من)

نظم ہو چکی۔ میں نے حُقے کو ہاتھ نہیں لگایا چاہئے البتہ آج دو

بسکٹوں کے ساتھ خوشی خوشی شکم سیر کر ڈالی۔ حضرت نے کہا کہ یہ پہلی نظم ہے جس میں کسی ہندوستانی شاعر نے میرے کلام کی رُوح بیان کی ہے۔ پھر مجھ سے اس کی نقل طلب کی۔ میں نے اُسی وقت بیٹھ کر نقل کر دی۔

پھر ایک دن آیا کہ علامہ نے مجھے جالندھر سے علی بخش کو بھیج کر طلب فرمایا تھا۔ میں حاضر ہوا تو آپ دردِ گردہ میں مبتلا تھے اور بہت ہی بیمار، مجھے دیکھتے ہی کراہتے ہوئے بولے :

"آ گئے حفیظ جی۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ گیا تو فرمایا "یہ دردِ گردہ شاید جان لے کے رہے۔"

پھر کہا "حفیظ تم میرا مرثیہ لکھنا۔"

یہ سُن کر میری چیخیں نکل گئیں۔ عرض کیا۔ میری اور مجھ ایسے ہزاروں کی جانیں خدا آپ کی عمر میں جوڑ دے گا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں آپ کو آرام آ جائیگا۔

وہ بہت رنجور تھے پہلے تو خاموش رہے پھر فرمایا۔ کوئی نعت سناؤ۔ میں نے "میرا سلام لے جا" پڑھا۔ علامہ زار زار روتے رہے۔ ہر بند کو دو دو مرتبہ سنتے اور روتے۔ پھر کہا۔ شاہنامہ میں سے ولادتِ رسولؐ کے اشعار سناؤ۔ میں نے سنائے۔ اب ان کو ذرا سکون سا محسوس ہوا۔ فرمایا۔ میرے لئے دعا کرو۔

اور بھی چند واقعات ہیں جو میں اپنی زیرِ ترتیب کتاب : "میرا اقبال میرا گرامی" میں وضاحت سے درج کرنے کی نیت رکھتا ہوں۔ دُوری بھی حضوری ہے۔

نادر "عجوبہ"

جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں، کچھ ایسا ہے جسے میں بارہ برس کی عمر سے اِس وقت تک صندوقِ سینہ میں چھپائے بیٹھا ہُوا تھا۔ آج جب کہ "ستّرہ دو بہتّرا" ہو جانے سے محض ایک سال کم یعنی اِکہتّرا بننے والا ہوں "سیارہ ڈائجسٹ" کے مدیرِ شہیر مقبول جہانگیر صاحب کا تحکّمانہ ارشاد مؤدّبانہ انداز سے موصول ہُوا ہے۔ چاہتے ہیں کہ میں ۱۹۷۱ء کے اوّلین روز شائع ہونے والے سالنامے کے لئے جلد سے جلد کچھ پیش کردوں۔ ساتھ ہی ارشاد ہے کہ یہ نذرانہ نثر میں ہو تو وہ شکرگزار، یعنی تعمیلِ ارشاد سے خوش ہو جائیں گے۔

اگرچہ اُن کو معلوم ہے کہ میں واقعی بیمار ہوں، میری عیادت کرنے والے گواہ بھی موجود ہیں، مگر میرا گناہ یہ ہے کہ میں اِس علالت میں بھی رواں دواں نظر آتا ہوں۔ جس کا سبب تنہائی اور اپنی تیمارداری، سانس رُکے تو رُکے مگر مجھے رکنے کی سعادت نصیب نہیں۔ لہٰذا مقبول جہانگیر صاحب اپنے اسلوبِ طلب کی وجہ سے مجھ ایسے دوست پرست سے شکست نہیں کھا سکتے۔

مجبور ہو کر کسی پُرانی تحریر کو چاق و چست بنا کر غیر مطبوعہ بنا کر نوک پلک

درست فرماکر "سیّارہ ڈائجسٹ" کے اُفق پر طلوع کرنے کی سوچ رہا تھا کہ اچانک سیّارہ ڈائجسٹ کا شمارہ دسمبر ۱۹۷۰ء وارد ہوا۔ جس کے ایک مضمون نے میری مشکل آسان کر دی۔ ایک مضمون سوجھ گیا جو نثر ہی میں انتہائی سادگی سے لکھا جا سکتا ہے۔ سیارہ میں شائع شدہ کا عنوان ہے "وہ کون تھا؟" نوشیندہ (سید) اکبر کاظمی، ہیں۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ان کا چھوٹا بھائی (سید) اصغر اچانک بیمار ہو گیا۔ ہر طرح کے طبی علاج کئے۔ آرام نہ ہوا۔ بیماری یہ تھی کہ برخوردار بیٹھے بٹھائے تڑپنے لگتا اور چیخیں مارتے مارتے بے ہوش ہو جاتا۔

اس قسم کے دَورے اسے گاہے گاہے پڑتے رہتے، علاج کرنے والے حکیم ڈاکٹر حیران تھے۔ آخر معلوم ہُوا کہ "رام رکھا" نامی ایک بھُوت کسی بے ادبی کا انتقام لینے کے لئے اس معصوم سر پر چڑھا ہُوا ہے۔

چنانچہ ایک بزرگ عامل نے کلام الٰہی کی کرامت سے اس نوجوان کو اس بھُوت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلائی۔ کاظمی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ان کا بھائی بفضلِ خدا آج ایک دفتر میں ہیڈ کلرک بھی ہے اور ہومیو پیتھ ڈاکٹر بھی"۔

"سیارہ ڈائجسٹ" یا اس قسم کے دوسرے صحیفے میں اس طرز کے واقعات جن لوگوں کی نظر سے گزرتے ہیں ان میں سے "بہت" پڑھے لکھے، "بہت" عقل مند حضرات ہنستے ہیں۔ اور بیان کرنے والے کو اگر دروغ گو نہیں تو ضعیف الاعتقادی کا مارا ہوا ضرور گردان لیتے ہیں۔

شاید میں بھی اسی روش کی دانشوری کا مظہر بن جاتا، لیکن مشکل یہ ہے

کر میں خود بھی چند ایک ایسے ہی واقعات سے دوچار ہو چکا ہوں۔ اس لئے کوئی کچھ بھی کہے آج میں بھی اپنے مشاہدے اور تجربے کے واقعات میں ایک ایسا عجوبہ بیان کئے دیتا ہوں جس کو دیکھنے والے ہزاروں لوگ تھے۔ شاید ان میں سے چند میری طرح زندہ موجود بھی ہوں اور میری تائید کریں ـــ خیر کوئی تردید کرے یا تائید میں بلا تکلّف بیان کرتا ہوں۔ :

میری عمر بارہ سال تھی۔ میرا لحن داؤدی بتایا جاتا اور نعت خوانی کی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کے مرض نے بھی مجھے آ لیا تھا۔ اس لئے سکول سے بھاگنے اور گھر سے اکثر غیر حاضر رہنے کی علّت بھی پڑ چکی تھی۔ جس کو میری زندگی کی ذلّت تصوّر کیا جانا گھرانے کے لئے لازمی تھا۔ بہر آئینہ اب تک اس ذلّت کی لذّت موجود ہے۔ میں خود حیران ہوں ۔ کیوں ـــــــ اور کیسے ؟

میری منگنی لاہور میں میرے رشتے کی ایک خالہ کی دُختر سے ہو چکی تھی۔ میرے خالو نے جب میری آوارگی کی داستان سُنی تو سیر و تفریح کے بہانے محترم نے جالندھر سے مجھے ساتھ لیا اور محض سیر و تفریح کا سبز باغ دکھلانے شہر گجرات کے قریب قصبہ جلال پور جٹاں میں پہنچ گئے۔ اصل سبب مجھے بعد میں معلوم ہوا، کہ ہونے والے خسر اور فی الحال خالو میرے متعلق اپنے دینی مرشد سے تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ وہ بزرگ انکی بیٹی کی شادی مجھ ایسے آوارہ سے کر دینے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں

ان کے قول کے مطابق میں تو اُس وقت اپنے خالو کا چہیتا نعت خوان

تھا. مجھے پیش کیا گیا. یہ پُرانوار پیر و مرشد ایک کہنہ سال بزرگ تھے. اُن کے اردگرد مؤدّب بیٹھے ہوئے دوسرے شرفا سے پہلے ہی دن میں نے نعت سنا کر واہ واہ، سبحان اللہ کے تحسین آمیز کلمات سُنے. بعدازاں ہمارے لیٔ کھانے پینے کے لئے بہتر سے بہتر جو کچھ دسترخوان پر ہوتا ایک خاص الخاص صُوفی نما کار فرما میرے سامنے چُنتا. اِردگرد کی سیر و تفریح کا انتظام تھا. اور ہر نمازِ عشا کے بعد میلاد کی بزم اور نعت خوانی کا اہتمام. گرمی کا موسم تھا. پنکھا جھلنے والے موجود تھے. دو مہینے اسی جگہ گزرے. اِس سال ساون سُوکھا تھا. بارش نہیں ہو رہی تھی. لوگ بارش کے لئے میدانوں میں جاکر نمازِ استسقار ادا کرتے تھے. بچے، بوڑھے، جوان مرد و زن دعا کرتے لیکن گھنگھور گھٹا تو کیا کوئی معمولی بدلی بھی نمودار نہ ہوتی تھی. یہ ہے پس منظر اس واقعہ کا جسے میں عجُوبہ کہتا ہوں. جسے بیان کر دینے کے لئے نہ جانے کیوں مجبور ہو گیا ہوں۔

پہلے یہ جان لیجئے کہ وہ محترم بزرگ کون تھے؟ مجھے یقین ہے ان کا خاندان آج بھی جلال پور جٹاں میں موجود ہے. ان بزرگ کا نام نامی حضرت حضرت قاضی عبدالحکیمؒ تھا. اسی بچاسی برس کی عمر تھی. دُور دُور سے لوگ ان سے دینی اور دُنیوی استفادہ کی غرض سے آتے تھے. یہ استفادہ دینی کم دنیوی زیادہ تھا. آنے والے اور دو تین دن بعد چلے جانے والے گویا ایک تسلسلِ امواج تھا. کثرت سوداگروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی تھی.

یہ پیر پرست لوگ پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے بھر بھر کے لاتے. ادب سے عرض معروض کرتے اور دیکھتے کہ پھل قصبے کی مساجد میں تعلیم پانے

والے بچوّں میں فوراً تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات جب واپس جانے کی اجازت چاہتے تو ان کے لئے دُعا کرنے والے پیر و مرشد یعنی حضرت قاضی صاحب جلال پور جٹاں کے بنے ہوئے دُھسّے بطور ہدیہ دے کر رخصت فرماتے ــــ..

چونکہ میری نعت خوانی کے سبب حضرت مجھے لبا اوقات اپنے مصلّے کے بہت قریب بٹھائے رکھتے تھے۔ ایک دن ان کے کسی خاص نیاز مند کے استفسار پر میں نے حضرت کا جواب سُنا کہ "بھئی! یہ لوگ تاجر ہیں، دُور سے آتے ہیں۔ واپس جاتے ہیں تو دینی مفاد کو دُنیوی مفاد سے بھی تولتے ہیں۔ حساب کرتے ہیں تو یہاں آنے جانے اور اپنی کمائی گنوانے کے مقابلے میں یہ دُھسّے ان کو زیادہ وزنی نظر آتے ہیں"

میری طرف دیکھ کر حضرت نے کہا: "برخوردار تم رسُول اللہ کے اسمِ گرامی سے مجھے خوش کرتے ہو، تمہارے لئے میرے پاس بس دعائیں ہی ہیں۔ انشاء اللہ تم دیکھو گے کہ آج تو تم دوسروں کی لکھی ہوئی نعتیں سناتے ہو، لیکن ایک دن تمہاری لکھی ہوئی نعتیں لوگ دوسروں کو سنایا کریں گے۔"

اُس وقت بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ سرکارِ دو جہاں کے یہ محبِّ صادق میری زندگی کا مقصود بیان کر رہے ہیں۔ بہرصورت یہ تو اُن کی کرامتوں میں سے ایک عام بات ہے جس عجوبے کے اظہار نے مجھ سے آج قلم اُٹھوایا وہ کرامتوں کی تاریخ میں شاید بے نظیر ہی نظر آئے۔

ایک دن حضرت قاضی صاحب کے پاس مَیں اور ان کے بہت سے

نیاز مند بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں میرے خالو بھی تھے۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔
اور حضرت مصلے پر بیٹھے تھے۔ السلام علیکم کہتے ہوئے کندھوں پر رومال ڈالے
سات آٹھ مولوی طرز کے معتبر آدمی کمرے میں داخل ہوکر قاضی صاحب سے
مخاطب ہوئے۔ قاضی صاحب نے وعلیکم السلام اور بسم اللہ کہہ کر بیٹھ جانے
کا ایما فرمایا۔ ہم سب ذرا پیچھے ہٹ گئے اور مولوی صاحبان تشریف فرما ہو گئے۔
ان میں سے ایک صاحب نے فرمایا کہ :

" حضرت! ہمیں ہزاروں مسلمانوں نے بھیجا ہے۔ یہ چار صاحبان
گجرات سے اور یہ وزیرآباد سے آئے ہیں۔ میں، آپ جانتے ہیں ڈاکٹر ٹیلر
کے ساتھ والی مسجد کا امام ہوں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ آپ اس ٹھنڈے ٹھار گوشے
میں آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر خلقِ خدا مر رہی ہے۔ نمازی اور بے نماز سب
بارانِ رحمت کے لئے دعائیں کرتے کرتے ہار گئے ہیں۔ ہر جگہ نمازِ استسقاء
ادا کی جا رہی ہے۔ کیا آپ اور آپ کے ان مریدوں کے دل میں کوئی احساس
نہیں ہے کہ یہ لوگ بھی اُٹھ کر نماز میں شرکت کریں اور آپ بھی اپنی پیری کی
مسند پر سے اُٹھ کر باہر نہیں نکلتے کہ لوگوں کی چیخ پکار دیکھیں، اللہ تعالیٰ سے
دعا کریں تاکہ وہ پریشان حال انسانوں پر رحم کرے اور بارش برسائے۔

میرے قریب سے ایک شخص نے چپکے سے اپنے دوسرے ساتھی سے
کہا : " یہ وہابی ہے "

میں اُن دنوں وہابی کا مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔ صرف اتنا سنا تھا کہ یہ صوفیوں
کو بُرا سمجھتے ہیں اور نعت خوانی کے وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی

خدمت میں جب سلام پیش کیا جاتا ہے تو یہ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ کھڑے ہونے والوں کو بدعتی کہتے ہیں۔

مسکراتے ہوئے قاضی صاحب نے پوچھا : " حضرات! آپ فقیر سے کیا چاہتے ہیں؟" تو ان میں سے ایک زیادہ مضبوط جُثّے کے مولوی صاحب نے کڑک کر فرمایا ۔" اگر تعویذ گنڈا نہیں تو کچھ دُعا ہی کرو۔ سُنا ہے پیروں فقیروں کی دُعا جلد قبول ہوتی ہے۔"

یہ الفاظ مجھ نادان نوجوان کو بھی طنزیہ محسوس ہوئے۔ تاہم قاضی صاحب پھر مسکرائے اور جواب جو آپ نے دیا وہ اس طنز کے مقابلے میں عجیب و غریب تھا۔

قاضی صاحب نے فرمایا " آپ کُتّوں سے کیوں نہیں کہتے کہ دُعا کریں"

یہ فرمانا تھا کہ مولوی صاحبان غضب میں آگئے اور مجھے بھی اُن کا غضب میں آنا قدرتی معلوم ہُوا۔ چنانچہ وہ جلد جلد بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے اور کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

قاضی صاحب کے ارد گرد بیٹھے ہوئے نیاز مند لوگ ابھی گُم سُم ہی تھے کہ مولوی صاحبان میں سے دو جو بہت جیّد نظر آتے تھے، دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے، اُن میں سے ایک نے کہا :

" حضرت! ہم تو کُتّے کی بولی نہیں بول سکتے۔ آپ ہی کُتّوں سے دُعا کرنے کے لئے فرمائیے۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے اور آج تک میرے سینے پر قاضی صاحب کا

یہ ارشاد نقش ہے "حضرت، پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ کل صبح تشریف لائیے گنتوں کی دعا ملاحظہ فرمائیے۔!"

مولوی صاحبان علنز اً مسکراتے ہوئے چل دیئے اور میں نے اُن کے الفاظ اپنے کانوں سے سُنے کہ "یہ صُوفی لوگ اچھے خاصے مسخرے ہوتے ہیں۔"

جب مولوی صاحبان چلے گئے تو میرے خالُو سے قاضی صاحب نے فرمایا کہ "ذرا چھوٹے میاں کو بلائیے۔" چھوٹے قاضی صاحب کا نام اب میں بھولتا ہوں۔ مہمانوں کی آؤ بھگت اور قیام و طعام کا سارا انتظام انہی کے سپُرد تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے اور دیگیں قاضی صاحب کی حویلی کی ڈیوڑھی اور صحن میں پکتی رہتی تھیں۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تھی۔ جس میں عشاء کی نماز کے بعد نعت خوانی ہوا کرتی تھی اور میں ذوق و شوق سے یہاں نعت خوانی کیا کرتا تھا۔

پیر صاحب یعنی بڑے قاضی صاحب کو میں نے اکثر دیکھا کہ مسجد میں جب نماز کے لئے صفیں بن جاتیں تو آپ خاموشی سے اپنی کوٹھڑی سے نکلتے اور نمازیوں کے جوتوں کے قریب کھڑے ہوکر نماز ادا کرتے پھر اپنے کمرے میں جا بیٹھتے۔ ہاں میں اپنے بیان سے بھٹک گیا تھا، میرے خالُو ان کے چھوٹے بھائی کو لائے تو قاضی صاحب نے ان سے کہا:

"میاں کل صُبح دو تین سو گنتے ہمارے مہمان ہوں گے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی بہت سا حلوہ راتوں رات تیار کرا لیجئے۔ ڈھاک کے پتوں

کے ڈیڑھ دو سو دَونے شام ہی کو منگوا کر رکھ لیجئے گا۔ ڈیوڑھی کے باہر ساری گلی میں صفائی بھی کی جائے۔ کل نمازِ فجر کے بعد میں خود مہمانداری میں شامل ہوں گا۔"

چھوٹے قاضی صاحب نے سر جھکایا اگرچہ ان کے چہرے پر تحیّر کے آثار نمایاں تھے۔ میرے لئے تو یہ باتیں تھی ہی پُراسرار، لیکن میرے خالو مسجد میں بیٹھ کر قاضی صاحب کے دوسرے مستقل نیازمندوں اور حاضر باشوں سے چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ کل صبح واقعی کچھ ہونے والا ہے۔

مَیں نے تین چار کڑاہ حویلی کے صحن میں لائے جاتے دیکھے۔ یہ بھی دیکھا کہ کشمش، بادام اور حلوے کے دوسرے لوازمات کے پُشتے کھل رہے ہیں۔ سُوجی کی سینیاں بھری رکھی ہیں گھی کے دو کنستر کھولے گئے۔ واقعی یہ تو حلوے کی تیاری کے سامان ہیں۔ ناریل کی ٹریاں کاٹی جارہی ہیں اور سب آدمی تعجب کر رہے ہیں کہ کتوں کی مہمانداری، وہ بھی حلوے سے ہے۔؟

مُرید لوگ بھی کُھسر پھُسر کر رہے تھے کہ ہم نے تو کبھی کتوں کو حلوا کھاتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا۔ قاضی صاحب کے بھتیجے چھوٹے قاضی صاحب کے فرزند جو بعد میں قاضی صاحب کے داماد ہوئے میرے ہم عمر تھے۔ نام محمّد اکرام تھا۔ وہ اس روز شام کو مجھے اپنی زمینوں پر لے گئے۔ دریائے جناب تک قاضی صاحب کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو بڑی زرخیز تھیں۔ بہت سے گھوڑے بھی ان کی ملکیت تھے۔ لیکن بڑے قاضی صاحب ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں جو ہمیں اللہ کے بندوں کی خدمت کے لئے تفویض کی گئی ہیں۔

ہمارے ساتھ ایک درویش بھی تھا جسے ہماری حفاظت اور نگرانی بلکہ خدمت کے لئے بھیجا گیا تھا. ہم نے اس درویش سے پوچھا: کیا کل واقعی کتّوں کی مہمان داری ہوگی؟ اور کیا کُتّے دُعا بھی کریں گے؟" میں یہ پوچھتا ہُوا ہنس بھی رہا تھا مگر درویش نے ہمیں ہنسنے سے منع کر دیا. کہا: "کیا کُتّے خدا کی مخلوق نہیں ہیں. سب دعا کرتے ہیں خدا سب کی سنتا ہے." قاضی صاحب کے بھتیجے نے کہا: "چلو جی. کل ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے."

شام کے وقت ہم زمینوں سے سیر کر کے واپس آگئے تو دیکھا کہ حلوے تیار ہو رہے تھے.

صبح ہوئی، نمازِ فجر کے بعد میں نے دیکھا کہ قاضی صاحب قبلہ دو تین آدمیوں کو ساتھ لئے ہوئے اپنی ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں ادھر اُدھر گھومنے لگے. چند ایک مقامات پر مزید صفائی کے لئے فرمایا.

میری اِن گناہ گار آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اس گلی میں دونوں طرف یک منزلہ مکانوں کی چھتوں پر حیرت زدہ لوگ کتّوں کی ضیافت کا کرشمہ دیکھنے کے لئے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے. اور جلالپور جٹّاں میں سے مختلف عمر کے لوگ اس گلی میں داخل ہو رہے تھے وہ قاضی صاحب کو سلام کر کے گلی میں دیواروں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاتے اور جانے کیا بات تھی کہ یہ سب اونچی آواز سے باتیں نہیں کرتے تھے. کوٹھوں پر عورتیں اور بچّے تھے.

ہم دونوں یعنی قاضی صاحب کا بھتیجا محمدؐ اکرام اور میں مسجد کی چھت پر چڑھ گئے اور یہاں سے گلی میں ہونے والا عجیب وغریب تماشا دیکھنے لگے.

درویش طرز کے چند آدمی حلوے سے بھری ہوئی سینیاں لاتے جا رہے تھے۔ اور قاضی صاحب پیچھے سے اِن دَونوں کو پُر کرتے پھر دونوں ہاتھوں سے دَونا اٹھاتے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر عین گلی کے درمیان رکھتے جاتے۔

جب پُوری گلی میں حلوہ بھرے دَونے رکھے جا چکے تو اُنہوں نے بلند آواز سے دَونوں کو گِنا۔ مجھے یقین ہے کہ گلی میں دیواروں کی طرف پشت کئے کھڑے سینکڑوں لوگوں نے قاضی صاحب کا یہ فقرہ سُنا ہو گا:

"کُل ایک سو بائیس ہیں"

یہ کام مکمل ہوا ہی تھا کہ زور زور سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جن کو مَیں انسانی ہجوم کی چیخیں سمجھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اُس وقت مجھے اپنے بدن میں کپکپی سی محسوس ہونے لگی۔ مَیں نے گلی میں ہر طرف دیکھا تو عورتیں، بچّے اور مرد گلی میں اور کوٹھوں سے چیخ رہے تھے۔

کیوں چیخ رہے تھے۔ اِس لئے کہ ایک کُتّا جس کو، جب سے میں یہاں وارد ہُوا تھا، حویلی کے اِردگرد چلتے پھرتے اور مہمانوں کا بچا کھُچا پھینکا ہوا کھانا کھاتے اکثر دیکھا تھا، بہت سے کُتّوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے گلی کی مشرقی سَمت سے داخل ہوا۔ جو بے شمار کُتّے اس کے پیچھے پیچھے گلی میں آئے تھے ان میں سے ایک بھی بھونک نہیں رہا تھا۔ بھونکنا تو کیا اس قدر خلقت کو گلی میں کھڑے دیکھ کر کوئی کُتّا خوفزدہ نہ تھا۔ اور نہ کوئی غرّا رہا تھا۔ کُتّے دو دو تین تین آگے پیچھے بڑے اطمینان کے ساتھ گلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

کُتّوں کی یہ پُراسرار کیفیت دیکھ کر ساری خلقت نہ صرف پریشان تھی بلکہ

دہشت زدہ بھی۔ پھر ایسی دہشت آج تک مجھے بھی محسوس نہیں ہوئی۔

قاضی صاحب اگر اپنے ہونٹوں پر انگشتِ شہادت رکھ کر لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین نہ کرتے تو میں سمجھتا ہوں کہ گلی میں موجود سارا ہجوم ڈر کر بھاگ جاتا۔

اس گلی والا وہ کتا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں قاضی صاحب کے قدموں میں آکر دُم ہلانے لگا۔ قاضی صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ بھی مجھے حرف بحرف یاد ہیں — فرمایا :

" بھئی کالو! تم تو ہمارے قریب ہی رہتے ہو۔ دیکھو، انسانوں پہ اللہ میاں رحمت کی بارش نہیں برسا رہے۔ اللہ کی اور مخلوق بھی ہم انسانوں کے گناہوں کے سبب ہلاک ہو رہی ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہو، سب مل بیٹھ کر یہ حلوہ کھائیں پھر اللہ سے دعا کریں کہ رحمۃ للعالمینؐ کے صدقے بادلوں کو اجازت دیں تاکہ وہ پیاسی زمین پر برس جائیں۔"

یہ فرما کر حضرت قاضی صاحب اپنی ڈیوڑھی کے دروازے میں کھڑے ہو گئے اور میں نے کیا سبھی نے ایک عجوبہ دیکھا۔

خدارا یقین کیجیے کہ ہر ایک حلوہ بھرے دونے کے گرد تین تین کتے جھک گئے اور بڑے اطمینان سے حلوہ کھانا شروع کر دیا۔ ایک بھی کتا کسی دوسرے دونے یا کتے پر نہیں جھپٹا۔ اور نہ کوئی چیخا چلایا اور جس وقت یہ سب کتے حلوہ کھا رہے تھے ایک اور عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا کہ وہ کتا جو اس گلی کا پرانا باسی اور ان تمام کتوں کو یہاں لایا تھا خود نہیں کھا رہا تھا۔ بلکہ گلی میں مسلسل ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا رہا۔ جیسے وہ

ضیافت کھانے والے کتوں کی نگرانی کر رہا ہو یا میز پالی

میں نے سکول میں اپنے ڈرل ماسٹر صاحب کو طالب علموں کی اسی طرح نگرانی کرتے وقت گھومتے دیکھا تھا۔ کالو کا اندازِ معائنہ بڑا پُر شکوہ تھا جس پر مجھے اپنا ڈرل ماسٹر یاد آ گیا۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی لڑکا ماسٹر صاحب کے سامنے منکتا تک نہیں تھا۔

تھوڑی دیر میں سب کتے حلوہ کھا کر فارغ ہو گئے۔ بے شمار لوگوں کے ہجوم میں سے صرف حضرت قاضی صاحب کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ وہ فرما رہے تھے :

"لو بھئی کالو! ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تاکہ خدا جلد ہی انسانوں پر رحم کرے۔"

یہ سنتے ہی میں نے غیر ارادی طور پر ایک طرف دیکھا تو کل والے مولوی صاحبان ایک سمت کھڑے اس قدر حیرت زدہ نظر آئے جیسے یہ لوگ زندہ نہیں یا سکتے کے عالم میں ہیں۔

اب صبح کے نو دس بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی تپش میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ جب قاضی صاحب نے "کالو" کو اشارہ کیا حیرت انگیز محشر بپا ہوا۔ تمام کتوں نے اپنا اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا لیا اور ایک ایسی متحد آواز میں غرانا شروع کیا جو میں کبھی کبھی راتوں کو سنتا تھا۔ جسے سن کر میری دادی کہا کرتی تھی : "کتا رو رہا ہے خدا خیر کرے۔"

آسمان کی طرف تھوڑی دیر منہ کئے لمبی غراہٹوں کے بعد یہ کتے جو شرقی

سمت سے اس کوچے میں داخل ہوئے تھے۔ اب مغرب کی طرف چلتے گئے
ہیں اور قاضی اکرام ہی نہیں جلالپور جٹاں کے سبھی مرد و زن کتوں کو گلی سے
رخصت ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اور خالی دو نے آسمان کی طرف منہ کھولے
گلی میں بدستور پڑے تھے۔ (یہ دستِ دُعا تھے)

جُونہی کتے گلی سے نکلے قاضی صاحب کے ہاتھ بھی دُعا کے لئے اُٹھ
گئے اور ان کی سفید برّاق داڑھی پر چند موتی سے چمکنے لگے۔ یقیناً یہ آنسو تھے۔

پس منظر بیان ہو چکا اب منظر ملاحظہ فرمایئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ
میں جو آج ستر برس اور گیارہ مہینے کا بوڑھا بیمار ہوں خدا اور رسولؐ کی قسم کھا کر
کہتا ہوں کہ بادل گرجا اور مغرب سے اس تیزی کے ساتھ گھٹا اُمڈی کہ گلی
ابھی پوری طرح خالی بھی نہ ہوئی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے بالے ابھی کوٹھوں سے
پوری طرح اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ بارش ہونے لگی۔ ہم بھی مسجد کی چھت
سے نیچے اُترے۔ پہلے مسجد میں گئے اور پھر حلوہ کھانے کا شوق لئے ہوئے
حویلی کی ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ دیکھا کہ وہی معتبر مولوی صاحبان چٹائیوں پر بیٹھے
ہیں اور حضرت قاضی صاحب حلوے کی طشتریاں ان لوگوں کے سامنے رکھتے
جا رہے ہیں۔ وہ حلوہ کھاتے بھی جا رہے ہیں اور آپس میں ہنس کر باتیں بھی کر
رہے ہیں۔ ایک کی زبان سے میں نے یہ بھی سُنا کہ حضرت یہ نظر بندی کا معاملہ
نہیں ہے تو اور کیا ہے — جادو — نعوذ باللہ —

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قاضی صاحب قبلہ ان کی اس بات پر دیر
تک مسکراتے اور ان بن بلائے مہمانوں کے لئے مزید حلوہ طلب فرماتے رہے۔

باہر بارش ہو رہی تھی اور اندر مولوی صاحبان خوشی سے حلوہ اُڑا رہے تھے۔ قاضی صاحب کے جو الفاظ آج تک میرے سینے پر منقوش ہیں مَیں یہاں ثبت کئے دیتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ یہی مقصود تھا۔

قاضی صاحب نے کہا تھا :

" کتّے مل جل کر کبھی نہیں کھاتے لیکن یہ آج بھلائی کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اللہ کے بندوں کے لئے دُعا کرنے کے لئے وہ اتنے متحد رہے کہ ایک نے بھی کسی دوسرے پر جھپٹا جھپٹی نہیں کی۔ ان کا ایک ہی امام تھا۔ اس نے کھایا بھی کچھ نہیں۔ اب وہ آئے گا تو مَیں اس کے لئے حلوہ حاضر کروں گا۔"

ایک مولوی صاحب نے کہا : " حضرت ہمیں تو یہ جادوگری نظر آتی ہے۔"

قاضی صاحب بولے : " مولوی صاحب! ہم تو آپ ہی کے فتووں پر زندگی گزارتے ہیں۔ خواہ اسے جادو فرمائیں یا نظر بندی آپ نے یہ تو ضرور دیکھ لیا ہے کہ کتّے بھی کسی نیک مقصد کے لئے جمع ہوں تو آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں۔" یہ سُن کر مولوی صاحبان جھینپتے نظر آئے۔

مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحبان کو بھیگتے ہوئے ہی اس ڈیوڑھی سے نکل کر جاتے ہوئے مَیں نے دیکھا تھا۔ بخدا یہ تجربہ اگر میں خود نہ دیکھتا تو کسی دوسرے کے بیان کرنے پر کبھی یقین نہ کرتا۔ یاد رہے کہ مَیں وہی حفیظ جالندھری ہوں جس کے بارے میں حضرت قاضی صاحب نے جلال پور جٹاں میں ساٹھ سال پہلے فرمایا تھا کہ حفیظ تیری لکھی ہوئی نعتیں دوسرے سنایا کریں گے۔

الحمد للہ۔ نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی "شاہنامہ اسلام" ساری دنیا کے اُردو جاننے والے مسلمان خود پڑھتے اور دوسروں کو بھی سناتے ہیں۔

عرض کر چکا ہوں۔ اس واقعۂ عجوبہ کی یاد میرے قلب و جگر میں گوشہ گیر تھی۔ اس موضوع پر صرف ایک مرتبہ میری مفصل گفتگو حضرت قاضی صاحب کے بھتیجے اور داماد قاضی محمد اکرام سے راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ جب میں آدم جی مسلم مڈل سکول کو ہائی سکول بنوانے کے لئے چندہ طلب کرنے کے غرض سے بُلوایا گیا تھا اور مجھے بلانے والے اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جن کا نام قاضی محمد اکرام تھا۔ جب میں پنڈی پہنچا تو یہ حضرت وہی محمد اکرام نکلے جن کے ساتھ جلال پور جٹاں میں مسجد کی چھت پر بیٹھ کر میں نے کُتوں کی دُعا کا منظر دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ ایسا کوئی سترا بہترا بوڑھا یا خاتون جلال پور جٹاں میں اب بھی موجود ہو گی جس نے میری طرح حضرت قاضی صاحب کی وہ کرامت دیکھی ہو۔

ہمارے بھوت پریت

بھوت پریت کا موضوع میرے ذہن میں مدتوں سے ہے عجب۔۔
عالم درپیش رہتا ہے۔ آخر آج میں نے کہا۔ یار جب سے میں نے بے تُکے
کاغذ پر لا رکھنے پر غور شروع کیا ہے جنوں اور عفریتوں نے ہر قدم پر میرے
خلاف محاذِ جنگ ہی بنا رکھا ہے کیا چڑیلیں: بھوت پریت ہی اپنے دانت
دکھانے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ اب یہ کالر، نکٹائی، سوٹ بوٹ، ہیٹ
والے بھی مجھے ہر سُو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔

موضوع ہنسا۔ ابھی سے گھبرا گئے۔ واہ،

یہ واہ کہتے ہوئے میرا موضوع سامنے سے ہٹ کر میرے دہنے
شانے کے قریب آگیا۔ اب دیکھتا کیا ہوں کہ اس کے مڑتے ہی ایک عجیب
غریب وضع قطع کی بھیانک شکل میرے سامنے ہے۔ اس شکل کے سر پر
گاندھی ٹوپی تو نہیں البتہ جسم پر کھدر کا تازہ انگریزی فیشن کا شلوکہ ہے۔
جس کا نام بُش شرٹ آجکل مشہور ہے (بُش کے معنی جھاڑی ہیں اور شرٹ
جو جسم کو چھپالے) دھڑ سے نیچے اس بُش شرٹ سے بھی موٹے "لوٹے" کی

پتلون ہے۔ سر اُلجھے ہوتے بالوں سے جھاڑ۔ چہرہ نہ گندمی ہے نہ سیاہ "سوا ہا" کے رنگ کا ہے۔ اس پر سیتلا دیوی نے اپنے دانتوں کے ایسے گہرے نشان چھوڑے ہیں جیسے کھال کے پیچھے کی اندرونی سیرت میں دھنسے ہوتے پھوڑے ہوں۔

میں نے دیکھا یہ شخص ایک بڑے آرائشی کمرے میں میز کے سامنے گھومنے والی کرسی پر اکڑا ہوا بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے ایک انبار ہے۔ ایک کلرک نما "چھوٹا صاحب" اس انبار کی دیوار بنا کھڑا ہے۔ یہ بھی کوٹ پتلون میں ہے لیکن یہ کوٹ پتلون کھدر کے نہیں غیر ملکی اُتار ہیں۔ اس کی گردن میں ٹائی بھی ہے۔ سامنے ایک کتاب کا انبار ہے۔ کتاب کا نام ہے آگ کا دریا ــــ یہ کتاب پاکستان کے مسلمانوں کو اسلامیت سے توڑنے اور مغل بادشاہ اکبر اعظم کی الہیت سے رشتہ جوڑنے کے لئے ناول کے رنگ میں حال ہی میں تصنیف ہوئی ہے۔ اور تاریخ کی وہی فضا قائم کرنے کی خاطر لکھی اور شائع کی گئی تھی جو شیوجی نے سکھایا تھا اور انگریزی دور میں جس نے مسلمانوں کو نچوایا گیا تھا۔ اس کتاب کے خلاف پاکستانی پریس یعنی اخبارات کی دہائی باہر سے اس کمرے تک گونج رہی تھی ــــ،

لیکن اپنی ماتا سیتلا دیوی کا کھدر پوش کالی ماتا کا سپوت (ایک بڑا صاحب ہے) اپنی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کلرک نما چھوٹے دفتری صاحب کو تاکید کر رہا ہے کہ دیکھو یہ کتاب ہم نے امریکی ویلیج ایڈ کے ذریعے ملی ہوئی رقم سے خریدوائی ہے۔ ہمارا حکم ہے کہ اس کتاب کو دیہات کی اصل ترقی کے لئے تمام

سنٹروں میں بھجوانے کا جلد انتظام کرنا آج ہی ضروری ہے۔

چھوٹے صاحب نے آہستہ آہستہ کچھ کچھ کہا۔ جس کی آواز میں سن نہیں سکا۔ جواب میں بڑے ماتا خوردہ صاحب کی آواز گونجی : بکنے دو جی، اس کے بکنے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی اعتراض کرے گا تو میں کاہے کے لئے یہاں بیٹھا ہوں۔ میں کسی ڈائریکٹر واریکٹر سے نہیں ڈرتا۔ تم کو میرا حکم ماننا ہے، یا پبلسٹی ڈائریکٹر کا۔ ویلیج ایڈ پر اب ہمارا حکم چلے گا۔ سنا تم نے ــــ!

بڑے صاحب کی ڈانٹ سن کر چھوٹے صاحب خود بھی اور باہر سے آکر چپڑاسی بھی چپ چاپ کتابیں اٹھا اٹھا کر لے جاتے رہے۔

میرا موضوع کہہ رہا تھا۔ حفیظ جی ــ یہ محض اس ایک کتاب کا معاملہ نہیں ہے فقط ایسی کتابوں اور کتابچوں ہی کے ذریعے نہیں اور بھی بہت سے مختلف طریق سے وہ تحریک چلتی ہی چلی جارہی ہے جس سے تم سربراہ ملک اور پاکستان کی حفاظت کے ذمہ دار افراد کو مطلع کر چکے ہو۔ پاکستان کو ختم کرنے کے لئے ثقافتی نام سے اس تحریک کے چلانے والے بعض لوگ تو اس اسلامی حکومت کے دفاتر ہی کے اندر ہیں۔ اور اپنے اقتدار سے کام لے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی کمائی کھا کر سب مسلمانوں کی جڑ کھودنے میں بالارادہ ممد و معاون ہیں اور وہ جو تم اقتدار کی کرسیوں سے چند روز ہوئے اٹھا دیئے گئے تھے وہ دفتروں کے باہر ان کے اشتراکی ہیں۔ خیالی نہیں یہ عملی لوگ ہیں۔ یہ نطفے ہیں مسلمان باپوں کے اور مسلمان کہلاتے ہوئے پاکستان کو ٹھکانے لگانے، اپنے بزرگوں

کی غلطی سدھارنے میں مصروف ہیں۔

میں نے پوچھا اے میرے موضوع بھائی۔ آخر ان کا اصل مقصد کیا ہے؟ میرے اس سوال سے میرا موضوع چڑ گیا۔ بولا: اچھا، تو آپ ابھی تک ان کا مقصد ہی نہیں سمجھ پائے۔ آپ کا حال یہ ہے تو پھر مجھے سامنے رکھ کر ہائے وائے کیوں ۔۔؟ لیجئے سنئے میں بتائے دیتا ہوں ان کا مقصد ہے پاکستان کے مقصود کا مضحکہ اڑانا، اسلام کا منہ چڑانا، ساری دنیا کو اپنے ہی اس ملک کو قائم رکھنے کے لئے کام کرنے والوں پر ہنسانا، مسلمانوں کی اولاد کو اسلام پر تمسخر سکھانا۔ تاکہ ۔۔۔۔۔۔! اب موضوع نے مجھے ایک عینک دی، کہا: آنکھیں کھول کر دیکھئے۔

دیکھتا کیا ہوں کہ فقط وہ ایک بیتلا سندر کا کھدر پوش بھوت ہی نہیں اور بھی سے مختلف وضع قطع کے اچھے خاصے "شریف بدمعاش" رات دن خلوتوں میں مشورے اور جلوتوں میں زبان کی کش کش اور اپنی تہذیبِ باطنی کی نمائش کے بل پر ایسی حرکات میں لگے ہوئے ہیں۔ جو محض چھاپے ہی کی سیاہی سے نہیں پاکستان پر اپنی ذریت کی بدنگاہی، بدکاری اور فحاشی کی نیت سے تھوپے چلے جا رہے ہیں۔ اسلامی شوکت کے لئے قومی و ملی جذبات ان بدمعاشیوں کا ایک دروازہ بند کرتے ہیں تو ان کی جگہ سو سوراخوں سے یہ چوہے پلیگ پھیلاتے ہیں۔ گلی کوچوں، گھروں تک میں اپنی تلبیس کی ابلیسی مہارنی الاپتے ہیں۔

میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا: اے خود بخود میرے قلم پر بھر آ(؟)

موضوع ! یہ تو بہت ہی بھیانک منظر ہے۔ یہ گندگی میں کب تک برداشت کروں ـــــ ،

موضوع ہنستا :- اجی، کم از کم ایک نظارا اور بھی دیکھ لو ـــــ '

میں نے پھر عینک جو آنسوؤں سے دھندلی ہو رہی تھی، صاف کی اور دیکھا ـــ !

اب دیکھا کہ ایک کمرے کے اندر ایک شریف زادہ ہمہ پیکرِ خوبی، سادہ رُو، تین آدمیوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ اُردو زبان کی ایک کتاب کھلی رکھی ہے۔ اور اس کے ورق اُلٹے جا رہے ہیں۔ ہر صفحے پر نشانات ہیں سامنے ایک بوڑھا بیٹھا ہے جس کے ہاتھ میں ایک مسودہ ہے۔ اس مسودے کو پڑھ پڑھ کر سنا رہا ہے۔ دو آدمی اور بھی سُن رہے ہیں۔ اور ان کے چہروں سے بھی تاسف اور غصہ ٹپکتا ہے۔

آخر بوڑھا خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی تند آنکھیں اس سادے شریف زادے پر جما دیں۔ شریف زادے کے چہرے پر قدرتی مسکراہٹ کی سُرخی زردی بنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا: آپ نے درست جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس جائزے کا قائل ان حکام کو کیسے کیا جائے جو خود اُردو کی کتاب نہ تو پڑھتے ہیں نہ کسی سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ میں نے اس کتاب پر آپ ہی کی طرف سے نہیں اپنی طرف سے بھی سخت اعتراض کیا تھا اور یہ حضرات جو بیٹھے ہوئے آپ کی تائید کر رہے ہیں سب اس شرارت کو روکنا چاہتے ہیں۔ ان سب کی رائے بھی لکھ دی تھی۔ اس کتاب کو فوراً ضبط کرنے کا

مشورہ ہر بڑے صاحب بہادر کے پاس تحریری طور پر پہنچادیا گیا تھا. لیکن ہماری تحریروں اور اعتراضوں کا جو بھی جواب آیا آپ بھی دیکھ لیجیے.

اب بوڑھے نے بغور بڑے افسیروں کا جواب بھی پڑھا. عطر اس جواب کا یہ آخری فقرہ تھا کہ Oh the book is vulgerly written thats all. No action required.

Agha - - - -
Secretary of the
Prime Minister Pakistan

یہ نظارہ دیکھ کر میری نگاہیں اپنے موضوع پر اٹھیں، وہ مجھے ترش نظروں سے گھور رہا تھا. میں نے آنکھیں جھکالیں. اور وہ کتاب جس پر تبصرہ بوڑھا کر رہا تھا اور جس کو محض معمولی ولگر کہہ دینے سے اعتراض رد کر دیئے گئے تھے اس کتاب کا نام تھا سنگم

میں نے مغل شہنشاہ اکبر کے دینِ الٰہی کی پھیلائی ہوئی تباہی کے ساتھ نیم براعظم کے مسلمانوں پر انگریز شاہی کی SUPERLATIVE ڈگری کی صلیب پناہی کے اصل وجوہ بیان کرتے جانے کے لئے پھر قلم اٹھا لیا. لیکن سب سے پہلے سنگم پر جو کچھ اس بوڑھے نے لکھا تھا ہتھیا لیا. کیونکہ وہ بوڑھا میں ہی تھا.

اور میں بھارتی تنخواہ زادوں کے اصل مقصد کے پوڈر آلودہ چہرے سے اتنا ہی سہی نقاب تو اتار ہی دینا چاہتا ہوں. تاکہ وہ کروڑوں جو ابھی کلمۂ طیبہ پڑھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے بچے اس کلمہ پر عمل بھی کریں گے وہ ان لوگوں کی اسلام کُش تحریک کے مقابل اپنی اولاد کی تعلیمات کا جائزہ لے

سکیں ـــــ میں جانتا ہوں کہ پاکستان بننے کے مخالف پرانے کوڑھیوں کے کوڑھ میں کھاج مسلسل جاری رہے گی. میں نے ان کو ذاتی طور پر بھی مخاطب کیا تھا. میرے اعتراض پر ان کے جواب کا لبِ لباب یہ ہے کہ :

اس کھاج کے سبب ہی تو ہم کو دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں سے بھیک مل رہی ہے. اور اے بوڑھے شاعر اگر تیرے قلم نے اس کوڑھ کے اصل وجوہ بیان کر دیئے تو سرخ رنگ والے اس ملک کی وہ مدد کیوں فرمائیں جو ہمارے ہی ذریعے مل رہی ہے. اور اگر یہ مدد نہ ملے تو ہو سکتا ہے کہ یہ کروڑوں مسلمان ہم سے نفرت کرنے لگیں بلکہ شاید ہمارے خنّاس الناس کے ذریعے پھیلتے ہوئے کوڑھ کا علاج خود ہی کر ڈالیں. پھر جو کچھ بھارت اور امریکہ سے مل رہا ہے اور اب روس سے ملنے کی توقعات ہیں اگر یہ تیل ہی نہ ملا تو ہماری رادھائیں بھارتی چولیوں میں ناچیں گی کیسے ؟

میں نے اُن کو شرمانے کے چند الفاظ کہے تو وہ ہنسے. میں نے علانیہ ان کے خلاف آواز بلند کرنے کی دھمکی دی تو چلّائے :

شاعرِ اسلام! جی ! ہم اس کوڑھ کی تہذیب کو جس طریق سے پھیلا چکے ہیں، آپ کر لیں جو کچھ ہو سکے. ہم اسکولوں، کالجوں کو مسجدیں تو ہرگز نہیں بننے دینگے.

"سہیلیاں" حیرتؔ اور عبرتؔ

ا۔ب۔ مدّت سے کسی سانحے، کسی واقعے، کسی بات، کسی واردات پر حیرت نے صورت دکھانا چھوڑ رکھا ہے۔ حیرت کی لوح پر عبرت کا قبضہ ہے۔ لیکن آج حیرت بھی نہ جانے کہیں سے آ ہی گئی ہے۔ عبرت اور حیرت دو معصوم بچیاں اوپر تلے کی بہنیں ہیں۔ اس وقت یہ دونوں اس کہنہ سال حفیظ کے قریب کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ اس طرح جیسے میری ننھی بیٹی رضا اور مرزا منور کی مُنّی بچی "گڑیا" باہم دو قالب یک جان آکر مجھے بہلایا کرتی ہیں۔

رضا اور گڑیا کو میرے شفقت بھرے ہاتھ کی ایک دو جنبشیں یا رضا کی امی قریب ہوں تو ان سے لے کر چند شکرپاروں کے ساتھ دونوں کو خوش کر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ دونوں سہیلیاں بہنیلیاں عبرتؔ اور حیرتؔ میرے دستِ قلم کی اَن گِنت محتاط جنبشوں کے لئے اس وقت محنت کی طلب میں کچھ زیادہ ہی چاہت چاہتی ہیں۔

آیئے۔ میرے پرانے سلسلۂ موضوع سے پیوستگی فرمایئے۔ لیکن سب سے پہلے ان دو معصوم جانوں حیرتؔ اور عبرتؔ کو بھی بہلا لینے دیجئے —،

اخبارات و رسائل کے صفحات پر دوسری نئی نویلی ملاقاتوں، رنگ رنگیلی خبروں اور اندرون و بیرونِ ملک کی کڑوی یا میٹھی رسیلی وارداتوں کا پڑھنا تو اب ہم سب کا وظیفۂ حیات ہے ہی، لیکن بالکل سادہ اور سیدھی باتیں بھی کبھی ہو جائیں تو گیا حرج ہے۔ ہاں میری ہنستی ہوئی باتیں اگر آنسوؤں سے کسی قدر بھیگی ہوئی یا گیلی نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ ؎

نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں
سخن کا اک ساغر پینا چاہتا ہوں

حیرت اور عبرت کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ کہ میں نے ۹ فروری کی صبح ساڑھے نو بجے ایک بہت ہی اہم تعلیمی مرکز میں کھڑے رہ کر شاہنامۂ اسلام سوا تین گھنٹے تک مسلسل سنایا۔ اس دوران پانچ منٹ دم لینے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ کیونکہ روزے کی وجہ سے گلا خشک تھا۔

آپ فرمائیں گے کہ اس میں حیرت اور عبرت کا کون سا قصہ ہے۔ آپ میں سے ایسے بہت سے اصحاب زندہ سلامت ہیں خدا سب کو حفظ و امان میں رکھے۔ جو چشم دید اور بہ گوشِ ہوش یہ گواہی دیں گے کہ ہم نے تو حفیظ کو چھ سات گھنٹے ہزاروں کے مجمع میں بیک وقت مسلسل، سلسلہ توڑے بغیر شاہنامۂ اسلام سناتے دیکھا ہے۔ پھر آج اس پر حیرت و عبرت کیوں مسلط ہیں

گواہیاں سچی ہیں ان پر کسی وکیل کے ذریعے نہیں خود آپ ہی رفقطاً اتنی جرح کرتا ہوں کہ مائی لارڈز۔ شاہنامۂ اسلام حفیظ کی زبان سے سننے سنانے

کہ جن واقعات کے آپ گواہ ہیں وہ واقعات یا تو کسی گزشتہ اور دُور دراز زمانے میں پیش آئے تھے پاکستان سے پیشتر یا پاکستان کی تشکیل کے بعد فقط افواجِ پاکستان نے اس انداز سے سُنے تھے

اگر سچ پر مقدمہ جیتا جاسکتا ہے تو فیصلہ میرے حق میں ہے اور فیصلہ یہ ہے کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد یعنی ۱۴ اگست ۴۷ء سے ۹ فروری ۱۹۶۲ء تک کی درمیانی مدّت پندرہ برس پانچ ماہ اور پچیس دنوں کے دوران کسی تعلیمی یا معاشرہ ملّی نے حفیظ کی زبان سے محض شاہنامۂ اسلام سننے کی ایک مرتبہ بھی تقریب منعقد نہیں کی۔ ہاں شعر و سخن کی رنگا رنگی کے مشاعرے میں حفیظ کا نام اور یہاں ہاں چند کالجوں میں حفیظ کے ساتھ ایک شام۔ پھر وہی پے درپے انجمن میں چندہ جمع کرنے کے لئے کسی اجلاس میں تازہ کیسہ ٹٹول کلام، بجا درست مگر شاہنامہ اسلام نہیں۔

پاکستان میں حفیظ سے محض شاہنامۂ اسلام کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت اِس سال رمضان شریف سے پہلے کبھی کسی رمضان شریف اور جمعۃ الوداع میں بھی نظر نہیں آئی۔ لہٰذا حیرت اور عبرت میری خدمت اور دل بہلاوا ہیں اور میرے آنسوؤں کی مُسکراہٹیں بھی۔

پاکستان کا نام زبان پر آنے سے بہت پہلے ۱۹۲۷ء میں جب میں ۲۷ برس کا تھا۔ میں نے ابھی تو میں جوان ہوں اور "رقاصہ" وغیرہ کو دھتا بتا کر شاہنامۂ اسلام لکھنا آغاز کیا تھا۔ اور ساتھ ہی نیم براعظم ہند کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کے لاکھوں ہزاروں سامعین میں سنانا شروع کر دیا

تھا تاکہ ہماری ملت از سرِ نو وجودِ پاک و اطہر صلی اللہ علیہ وسلم اور آں حضرت کے صحابۂ کرام کی سیرتوں سے کچھ بصیرت حاصل کر لے۔

برِ عظیم برِ اعظم ہند میں پشاور سے حیدر آباد دکن اور مدراس تک، کراچی اور بمبئی سے کلکتہ، رنگون، برما تک، شیلانگ سے کشمیر تک، کون ایسا قابلِ ذکر مقام ہے جہاں مشاعروں سے الگ رہ کر خالص شاہنامۂ اسلام حفیظ ہی سے نہ سُنا گیا ہو۔

لیکن پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے اندر مشاعرے بہت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ شاعروں کے علاوہ معاشرتی اور تعلیمی جلسے بھی ہوتے ہیں جن میں حفیظ کو حاضری اور شمولیت کی عزت تو بخشی جاتی ہے لیکن حفیظ کے کھڑے ہوتے ہی ابھی تو میں جوان ہوں، اور رقاصہ ہی کا شور مچتا ہے۔ غزل، نظم اور ترانہ ہی کی طلب رہتی ہے۔ خدانخواستہ اگر مشاعرے یا کسی دوسری طرز کی تقریبوں، مجلسوں، محفلوں میں کسی طرف سے شاہنامۂ اسلام کی فرمائش بھی ہو جائے تو حفیظ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بے شمار نامی گرامی شاعر منہ بسور لیتے ہیں۔ اور سامنے سامعینِ کرام جو خیالی محبوباؤں سے وصل و ہجر اور تصوری چوما چاٹی کے عارضی گناہِ بے لذت ہی کے لئے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ کسمسا کر چپ سادھ لیتے ہیں۔ چُپ اس لئے کہ جن دو چار آدمیوں نے شاہنامۂ اسلام کی فرمائش کی ان میں کوئی تیز کلام مُلّا اُٹھ کر وعظ نہ شروع کر دے۔ اب اگر حفیظ نے سلام بحضور خیر الانامؐ سُنا دیا تو یہ شاعر نواز، سخن فہم گھروں کو جاتے ہوئے تخیلی ترچھی نگاہوں کی ہوس انگیز

برچھیاں کھا چکنے کی لذت کے ساتھ حفیظ کا یہ آخری صداقت شعار وار بھی شاید سہہ جاتے ہوں۔

پاکستان میں ۱۴ برس سے جہاں تک حفیظ جالندھری کا تعلق ہے۔ کم و بیش یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ پھر حفیظ پر عبرت کیوں طاری نہ ہو اور یکایک عبرت کے ساتھ حیرت بھی کیوں نہ سامنے آجائے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ یہ مشاعرہ نہیں، کوئی گھریلو محفل نہیں تھی پاکستان کے ایک اہم ترین شہر کے اندر، ملک کے اہم ترین تعلیمی جامعہ (کراچی یونیورسٹی) کے نئے تعمیر شدہ ایوان میں کوئی بڑا نامی گرامی شاعر بھی موجود نہیں تھا ــــ، بوڑھا حفیظ پاکستان کی تشکیل کے بعد آج پہلی مرتبہ خاص طور پر محض شاہنامۂ اسلام سنانے کی دعوت پر لبیک کہتا ہوا تنہا حاضر ہوا تھا ہے نا حیرت انگیز بات ــــ ،

سامعین کون تھے۔ جامعہ کراچی کے نوجوان و نوخیز طلبہ اور طالبات مسلمانوں کی چند حیادار بیٹیاں بھی اور غیرت مند فرزند بھی۔ ان فرزندوں اور دختروں کے اساتذہ بھی۔ یہ سب سامنے قطاروں میں بیٹھے تھے۔ صدارت کی کرسی پر ایک، نوجوان یعنی طلبہ ہی میں سے منتخب بالغ نظر طالب علم، اور اس کے داہنے ہاتھ کون تھا؟ ہمارے ملک کی تعلیمات کا سب سے بڑا معمار و نگران کار، شیخ الجامعہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔

حفیظ نے پاکستان میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ علانیہ اپنی شاعرانہ فردیت کو "مبارکباد" کہا تھا۔ اس مبارکباد کو جائز اور واجب ثابت کرنے

کے لئے وضاحت بھی کی گئی کہ اگرچہ پاکستان سے پہلے حفیظ سندھ مدرسہ اور خالق دینا ہال اور حاجی عبداللہ ہارون کے اہتمام سے منعقد ہونے والے ذی شان جلسوں میں مسلمانوں کی سرد شدہ غیرت کو گرمانے کے لئے شاہنامۂ اسلام ہی سنانے آچکا ہے لیکن اس قومی وطن کے حصول کے بعد آج یہ پہلا تاریخی دن ہے جو حفیظ کو پنڈی سے کراچی محض شاہنامۂ اسلام ہی سنانے کے لئے لایا اور اس نے چند کالے سرخ رو لڑکوں کے اصرار کی پروا نہ کرتے ہوئے شاہنامۂ اسلام ہی سنایا۔ اور عزت و آبرو کے ساتھ اس یونیورسٹی سے نکل آیا۔

اے میری بیٹیو حیرت اور عبرت! تمہارے لئے میں نے یہ واقعہ کاغذ پر لکھ دیا ہے پاکستان کی تاریخ میں یہ تم دونوں کے نام منسوب رہے گا۔ کیوں اب تو خفا نہیں نا ــــ بیٹیاں زیادہ دیر تک خفا نہیں رہا کرتیں۔

پنجابی حفیظ،

نوائے وقت کے "سرِراہے" نویس کے اندازِ تحریر کی داد میری طرف سے تو یہ ہے کہ میں "پیرِ شو بیا موز" پر عامل ہو گیا ہوں۔ اس ظالم اُستاد نے مجھے اپنی طفلی کی شرارتیں ہر صبح اپنے سامنے لا رکھنے کا اشتیاق زندہ کر رکھا ہے۔ میں اس کا شکرگزار بھی ہوں اور کبھی کبھار یہ بھی چاہتا ہوں کہ چند واہ وا کے الفاظ سے اسے مخاطب بھی کروں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ یہ اُستاد کہیں گوشمالی نہ فرما دے۔ اس لئے مزے لیتے رہنے پر اکتفا تھی۔ اس وقت بے اختیار قلم اٹھایا ہے۔ آج ۷ار دسمبر ۱۹۷۳ء کے شمارۂ نوائے وقت کا سرِراہے میرے سامنے ہے اور تذکرہ ہے چرس کا۔ میرے شعر و شاعری کے اوّلین (نادیدہ) استاد کے مصرع ؎

چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی

کے حوالے سے جو کچھ ان دو کالموں میں بھر دیا گیا ہے وہ ادبی سُلفے کی لاٹ سے کم نہیں۔ بلکہ ایسا ہے کہ چرس کا تصوّر کرنے والوں کے سامنے یہ لاٹ لوہا لاٹ بن کر ہمیشہ وہی عالم قائم رکھے گی جو سرِراہے نویس نے ایک شاعر

کے پنجابی شعر کے حوالے سے چمکا دی ہے۔ اور یہ شعر اس طرح ہے کہ ؎

رَن نہَا کے چَھپڑ دچوں نکلی سُلفے دی لاٹ وَرگی

جس "ظالم شاعر" کا یہ شعر ہے وہ ابھی زندہ ہے۔ اگرچہ اسکی موجودہ زندگی خود اسی کے بقول زندگی ہے بھی اور ہے بھی نہیں کے عجیب و غریب برزخ میں ہے اس سُلفے کی لاٹ کو دیکھ کر شعر میں مبرِ لب کے لئے ظالم شاعر کہلوانے والا شاعر ہی سہی۔ یہ ۷۴ برس کا پیرِ نابالغ ہی تو ہے جس کا نام حفیظ جالندھری اُنہی دنوں سے ہے جبکہ آتش جواں تھا۔ مناسب ہے اصل واقعہ یعنی اس شعر کی شانِ نزول بیان کر دی جائے۔ حفیظ جب طالبعلم تھا۔ جالندھر کے مشن ہائی سکول میں ہر روز آتا جاتا رہتا تھا۔ سکول سے بھاگنے اور کسی گوشہ میں چھپ کر شعر کہنے کی بھی بیماری تھی۔ "باہریوں" کا تالاب اس راہ میں تھا جس میں چند ہندو مرد عورتیں نہاتی نظر آیا کرتی تھیں۔ اس تالاب کے کنارے ایک جگہ دو تین موٹے تازے سادھو مستقل متمکن تھے۔ وہاں بھنگ گھوٹتی اور چرس پینے والے جمع رہتے تھے۔ ہندو دیویوں کے اشنان اور یہ چرس پینے کی شان میرے لئے عجیب و غریب مماثلت کا سامان تھا۔ میں اُن دنوں اور پھر سکول سے ہمیشہ کے لئے بھاگ جانے کے بعد پنجابی کے شعر بھی کہا کرتا تھا۔ جالندھری پنجابی شاعری "بولی" کہلاتی تھی۔ اس کے دو مصرعے ہوتے تھے۔ دونوں کا وزن الگ الگ ہونے کے باوجود موسیقی کی لَے میں ایسے پیوستہ تھے کہ ہم نوجوان جُنڈی یعنی چھوٹے جتھے بنا کر ان کو بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں گاتے پھرا کرتے تھے۔ میں اُس دور میں ان نوجوان جتھوں

کامرغنہ، سربراہ، لیڈر جو کچھ بھی لقب دیجئے بولیاں بناتا اور ان کو ساتھ لے کر گاتا پھرا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ یہ بولی : رن نہا کے چھپڑ وچوں نکلی سُلفے دی لاٹ ورگی (جس کا اردو ہے) خاتون نہا کر پانی کے گڑھے سے ابھری (اس طرح جیسے) چرس کی آگ کا شعلہ ہو۔ تصوّر فرمایئے۔ پانی سے لبریز (تالاب) گڑھا، اس میں ایک جوان عورت ڈبکی لگا کر اُبھری۔ ملحوظ رہے کہ عورت جب دریا میں نہاتی ہے تو وہ اِدھر اُدھر دائیں بائیں اپنے جسم کو حرکت نہیں دیتی۔ مردوں کے خلاف وہ جلد جلد سیدھی رہ کر ڈبکی دیتی اُبھرتی ہے۔ اور اس لئے عجلت میں ہوتی ہے کہ اُسکو کوئی دیکھ نہ لے۔ اب پانی کے چھپڑ میں سے وہ اُبھری اور شاعر کی نظر میں وہ منظر آگیا کہ "سُلفہ" ایک مٹی کی لمبی چلم پر کپڑے کی دھجی لپیٹے ہوئے چلم کے چھوٹے سے اوپر کے دہانے پر سلفے کو جانے ہوئے سلگتے کوئلے سے سلگاتا ہے اور چلم کے نچلے منہ پر لپٹے کپڑے کی نالی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے اپنے منہ کے دونوں لبوں سے واصل کرتا ہوا ایک لمبا دم اپنے سینے کی طرف کھینچتا ہے تو کیا ہوتا ہے یہ کہ دم کھینچتے ہی چرس پر رکھا ہوا کوئلہ سُلفے کی آگ مشتعل کر دیتا ہے۔ ایسی مشتعل کہ اس منظر میں ایک ایسا شعلہ اس چلم سے اُبھرتا ہے جیسے روشنی کا ایک لپکا۔ عین سیدھا آنکھوں میں خیرگی پیدا کرنے والی بجلی سے زیادہ چشمک زن۔ — یہ ہے اس دیوی کا پانی میں سے ڈبکی لگا کر فقط ایک ساعت شعلہ اُبھرنے کا استعارہ۔ اس بولی کو میں نے اس دور کی بیساکھی کے میلے ٹھیلوں میں اپنے سکھ ہمجولیوں کی قیادت فرماتے ہوئے گایا تھا۔ آج وہ منظر اور وہ شرارت کا زمانہ مرزا ادیب نویس نے یاد دلایا — اور یہ الفاظ لکھنے پر اُکسایا

"مرحوم" شاہد'

"مرحوم" یعنی جس پر اللہ کی طرف سے رحم کیا گیا۔ کیا اچھا اور مبارک لفظ ہے۔ لیکن نہ جانے کب سے اور کیوں یہ لفظ بطورِ اصطلاح محض اس وجودِ محض' اُس فرد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے جس کے تن بدن کو روح سے فارغ! کر ہم مٹی میں دفن کر دیتے ہیں، اور سمجھ لیتے ہیں کہ (کم از کم) اس زمینی زندگی میں ہم اس کے محسوس وجود سے محروم ہو گئے ہیں۔ احباب سے جدائی کا قلق لازمۂ انسانیت ہے۔ بلکہ اللہ کی وہ مخلوق جو بشر نہیں کہلاتی اس میں بھی ایسے انواع ہیں جن کو مر جانے والے ساتھی کو غم و اندوہ میں پایا گیا ہے۔

پوری طرح تو معلوم نہیں کہ یہ انسان نہ کہلانے والی مخلوق اپنے سے جدا ہو جانے والے تک اپنے غم و رنج کا فائدہ یا تاثر پہنچانے کے لئے کیا کیا روش اختیار کرتی ہے البتہ ہم احسن المخلوق کہلانے والے لوگوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ جسے ہم سپردِ خاک کر آئے ہیں اس کی روح کسی برزخ میں جانے سے پیشتر ہمارے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ ذہنی اور مادّی اغذیہ جن کی وہ لذّت چشیدہ رہ چکی تھی۔ اب بھی ان اشیا کی طالب ہے۔ لہٰذا خاص طور پر ہم مسلمان

مختلف طریق سے اُس کی رُوح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ختم شریف قرآن خوانی اور دوسرے مقدس کلمہ و کلام کے وِرد سے بھی اور طرح طرح کے طعام ہائے لذیذ سے بھی اور جن میں زیادہ ہمت ہے وہ اچھے اچھے لباسوں کے ذریعے بھی اس رُوح کو مطمئن کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ چالیس دن تک اگر ہر روز نہیں تو ہر جمعرات کو ختم شریف اور اَغذیہ کی دعوتیں اپنے عزیزوں اور مساجد کے مولویوں، اماموں اور ان کے طلبہ یا چند مساکین کو دیتے ہیں، خود بھی کھاتے پیتے ہیں، برادری کو بھی کھلاتے پلاتے ہیں۔ اس طرح اُس مرحوم کی رُوح کو ثواب پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے جُداگانہ طریق رکھتے ہیں اس کا تذکرہ یہاں لاحاصل ہے۔ البتہ ایک بات مختصر طور پر عرض کر دینے کے لئے اس وقت میری طبع مجھے مجبور کر رہی ہے۔ وہ ایک بات یہ ہے کہ ہم اہلِ قلم لوگ کسی مشہور انسان کی رحلت کی خبر پڑھتے ہی یا سُنتے ہی اخباروں میں "مرحوم" کا تعزیتی تذکرہ نظم یا نثر میں چھپوا دینے کے لئے ایسی عُجلت دکھاتے ہیں جیسے ہم اس فرد کی موت کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ گویا ایک لکھا لکھایا بیان جیب ہی میں تھا یا گھڑی گھڑائی نظم سنوری سنورائی ملفوف موجود تھی تاکہ دیر نہ لگے اور اخبارات کے کالموں پر اللہ کو پیارے ہو جانے والے کے اوّلیں ماتمی ہمیں نظر آئیں۔ للعجب۔

مَیں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ گھریلو جو اقارب کہلواتے تھے، مگر ہمیشہ عقارب بنے رہتے تھے، اب وہ اپنے شور و شیون اور تشریف لے جانے والے فرد کی مادّی اشیا پر روحانی ہاتھ "پاک صاف" کرنے کی جھڑیوں اشک

افشانی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ ایسے چند مشاہدوں نے مجھ سے بھی سادہ سا مطلع کہلوا دیا تھا۔ ؎

جسے محوِ خوابِ عدم دیکھتے ہیں
اُسے کس تسلّی سے، ہم دیکھتے ہیں

آہ — میں کس راہ پر چل نکلا۔ حواس باختہ ہوں نا —— مجھے تو شاہد احمد صاحب کے بارے میں کچھ لکھنا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے جب وہ ہم میں روح و تن کی جامعیّت کے ساتھ موجود تھے، اللہ رحیم کے دامنِ رحمت سے کبھی باہر نہ تھے اور نہ باہر ہم ہیں۔ تاہم شاہد صاحب کو اپنے بزرگوں کی تقلید میں "مرحوم" ہی کہنا اور لکھنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم کسی ایسے بیمار کو بھی جو آخری سانس لے رہا ہو، اس کے منہ پر "مرحوم" کہہ دیں تو اس کا دل توڑ کر مار ڈالنے کے جُرم میں اِرد گرد کے لوگ ہماری ہڈیاں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ شاعروں کے "محروم" تخلص تو سُنے ہیں اُن سے ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔ "مرحوم" تخلص کسی نے یا تو اب تک کیا ہی نہیں یا میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں خود — کہ شاعر کہلاتا ہوں۔ سِرے سے تخلص ہی نہیں رکھتا۔ وہی حفیظ کا حفیظ میرا نام ہے جو ولادت کے بعد بزرگوں نے تجویز فرما دیا تھا۔ لیکن عنقریب "مرحوم" ہونے والا ہوں۔ کیونکہ ؎

پیام آرہے ہیں مرے دوستوں کے
مری راہ اہلِ عدم دیکھتے ہیں

شاہد صاحب سے میرے ذاتی مراسم یک رُخہ طرز کے تھے۔ یک رُخے پن

کی یہ کہانی طولانی نہیں ہے۔ البتہ اس مختصر کہانی کی تمہید مختصر نہیں۔ اس تمہید کے دوران میرا تصور جو تصویر آپ کے حضور پیش کرے اس میں خود میرے اُڑے ہوئے رنگ کی ابتدائی جھلک آپ کو نظر آئے گی۔

لڑکپن میں میری والدہ نے چند ایسی کتابیں، پڑھنے اور پھر عمر کے بڑھنے یا ترقی کرتے چلے جانے کے ساتھ ساتھ ان کو سمجھنے اور اگر اللہ توفیق دے تو جہاں تک ہو سکے ان سے اثر لینے اور ان پر عمل کرنے کا شوق عطا فرمایا تھا۔ ان میں دوسری نظمیہ پنجابی کتب کے علاوہ اردو کی مسدس حالی کے بعد ——— مرۃ العروس، توبۃ النصوح اور بنات النعش بھی اور علامہ راشد الخیری کی کتب کی غم آلود داستان ہائے حیاتِ مستورات بھی تھیں اور مجھ پر حالی کے بعد سب سے بڑا اثر ڈپٹی نذیر احمد (مغفور) کی مذکورہ بالا کتابوں کا جن دنوں زیادہ پڑا تھا اسی زمانے میں میرے سر شعر و شاعری کا بھوت بھی سوار تھا۔ مسجد میں ناظرہ قرآن کریم اور کریما نامقیماں تو رٹ چکا تھا، اب اسکول میں دادِ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اسکولی درسی کتب میں میرے ذوقِ شاعرانہ کے جنون کا علاج نہیں تھا۔ پہلے اسکول سے بھاگ کر گلی کوچوں اور پھر اپنے شہر سے بھاگ کر کپورتھلہ، امرتسر اور لاہور کی سیر و سیاحت فرمائی جاتی رہی۔ لیکن "آبِ حیات" کے جرعوں نے دل میں دلّی کی سیر کا دریا موجزن کر رکھا تھا۔ اردو زبان سے اتنی والہانہ شیفتگی نہ جانے کیوں تھی کہ اب کتابوں سے اردو کے مرکز کے بسنے والے میرے دل میں رس بس گئے تھے۔ داغ کی زبان اور شعری آنوٹیں میرے گوشہ ہائے قلب میں کروٹیں لے رہی تھیں۔ آخر اپنے پالنے والے دانا کرم بخش

خاں کے خفیہ خزانے سے کچھ اُڑایا۔ اپنے ہم سن اور ہم قدم دو رفیقوں کو ساتھ لیا۔ معمولی سے کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بکس اور ایک ایک کمبل دو دو چادریں اور تکیے باندھ کر مَیں نے تھرڈ کلاس کے تین ٹکٹ خریدے اور دوسرے ہی دن ہم تینوں دہلی پہنچ گئے ــــ رانا کرم بخش خاں میرے والد کے ماموں لگتے تھے۔ یہ بھی اور ان کی بڑی بھاوجہ (جو میرے گھر سے بھاگنے سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں) لاولد تھے اور ان دونوں نے مجھے اس دُنیا میں وارد ہوتے ہی میرے دادا رانا حاجی مہرالدین خاں سے خیرات کے طور پر اپنی جھولی میں ڈال کر متبنٰی بنا لیا تھا۔ لہٰذا چٹورپن، کھلنڈرا پن، بیباکی نڈری اور اسراف کے لئے ضد میرا پیدائشی حق تسلیم شدہ تھا۔ روک ٹوک والد کی طرف سے اور سرزنش والدہ کی طرف سے ہوتی۔ لیکن متبنٰی بنانے والا بزرگ رانا کرم بخش خاں ان سب پر حاوی تھا۔ یہ معترضہ جملے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ۱۲ برس کی عمر میں دہلی پہنچنے اور وہاں طفلانہ کوچہ گردی کا سبب وجود ہی رہے۔ مَیں حاضر ہوں۔ ابھی غائب نہیں ہو سکا۔

میرے ساتھیوں میں ایک اپنے باپ کے ساتھ دہلی دیکھ چکا تھا، لہٰذا اُس نے فتح پور مسجد کے قریب بہت بڑے ہوٹل میں جس کا نام کارونیشن ہوٹل تھا، ٹھہروایا اور۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہُوا کہ دہلی بڑا شہر ہے، لاہور سے بڑا اور زیادہ بارونق، کیونکہ شفیع کی سرائے میں نہیں اب تو ہم ایسے عالی نظر سیاح ہوٹلوں میں قیام فرمانا لازم آیا تھا۔ فسانۂ آزاد مَیں پڑھ چکا تھا۔ لیکن اس میں لکھنؤ کی بھٹیاریوں اور کارواں سراؤں کا ذکر تھا۔ انھیں مجھے بعد میں

شرف بخشتا تھا۔ اب تو ہم دہلی میں تھے۔ میرے ساتھی شعر و شاعری یا ادب سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تھیٹر یا جامع مسجد کے اِرد گرد مداریوں اور دَوا فروشوں کے تماشائی اور تمنائی تھے اور میں دِلّی کی اُردو کا وہ لہجہ سیکھنے کا سودائی تھا جس کے محاورات مراۃُ العروس اور توبتہ النصوح کے ہر صفحے کی سطر سطر پر بکھرے ہوئے تھے۔ آخر پوچھتے پاچھتے تن تنہا میں ایک دِن مسجد تھوّر خاں کے قریب کوچہ بتاشاں میں جا نکلا۔ یہ عجب لذیذ کوچہ تھا۔ آہا چٹخارے دار خوشبوئیں یعنی چھوٹی دُکانوں میں رنگ رنگ کے اچار، مرّبے، پاپڑ اور سکھوں کی دُکانوں پر بڑیاں۔ یہ سب کچھ میرے لئے منہ میں بار بار رال بھر آنے کا سامان تھا کہ ایک ہی جگہ جمع تھا میں نے یہاں پہلی مرتبہ جل جیرا (زیرے کا آبِ زلال) پیا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑی حویلی کا پھاٹک تھا۔ اور یہی وہ حویلی تھی جس کی تلاش مجھے کوچہ بتاشاں میں لائی تھی۔ دکانوں پر بتاشے تو بہت تھے لیکن بہت سی دُکانوں سے عجیب و غریب سی آوازوں کی دھمک میرے لئے دہلی کی پہلی راگنی تھی، جو اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہت مدّت کے بعد جب مجھے معلوم ہُوا کہ شاہد احمد صاحب ڈپٹی شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کے پوتے، موسیقی کے دِلدادہ ہیں تو اس انکشاف پر میرے کانوں کو اُسی دھمک یا تھپک کی لَے یاد آگئی۔ یہ کیا تھا؟ یہ دُکانوں میں سونے اور چاندی کے ورق کوٹ کر بنائے جا رہے تھے۔

بہر حال میں، اُس حویلی کے کھُلے پھاٹک سے ڈیوڑھی میں داخل ہُوا اور پکارنا شروع کیا "ڈپٹی صاحب! شمس العلماء صاحب، مولوی نذیر احمد صاحب!"

اور یہ صدائیں ایسے پنجابیانہ گنوارپن کی چِلّاہٹ کے ساتھ بلند کیں کر ڈیوڑھی سے آگے جو در بند تھا اس کے کھلنے سے پیشتر کوچہ بتاشاں کے لالہ جی اور بھائی لوگ ہی نہیں اور بہت سے لونڈے لاڑیے بھی جمع ہو کر میری وضع قطع اور اس چِلّاہٹ پر ٹھٹھا اڑانے لگے۔ میرے سر پر بے پھندنے کی ترکی لال ٹوپی، دھڑ پر لکیر دار قمیص اور قمیص پر کوٹ، لیکن کمر سے نیچے نیلے رنگ کا پنجابی چادرہ تھا جسے بڑی عمر کے لوگ اَن پڑھ ہوں تو تمت، پڑھے ہوئے تہمد اور ہم چھٹکی کلاس کے نوخیز اسے تہمدی کہتے تھے۔ لُنگی اور لاچہ وغیرہ بھی اس کے پنجابی نام ہیں۔ اس لباس کے ساتھ میرے پیروں میں کالا چکدار پمپ تھا جس کو میں نے دہلی ہی سے خرید کر پہن لینے کی عزت بخش دی تھی۔ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ میری یہ عمر اور یہ وضع قطع اور یہ چلّاہٹ اور ایسے لاثانی بزرگ کا نام نامی اسم گرامی پکار پکار کر محلے بھر کو سر پر اٹھا لینا دہلی والوں کے لئے پھبتی کسنے کی خاطر کس قدر مضحکہ انگیز حرکات تھیں۔ میرے گرد ایک بھیڑ لگ گئی۔ یہ لوگ داڑھیل بھی اور بے داڑھی کے مسلمان بھی تھے۔ دھوتی پوش لالہ جی لوگ بھی، لیکن سب سے زیادہ ٹھٹھول وہ لڑکے تھے جو شاید میری ہی عمر کے ہوں۔ ان کے لباس مَیلے چکٹ تھے۔ اُن کی بولی داغ اور ڈپٹی نذیر احمد کی بولی نہ تھی۔ مدّتوں بعد معلوم ہوا کہ یہ دِلّی کے کرخنداروں کی ٹھٹھولی تھی۔ بہرآئینہ میں اُن کے لئے ایک بولتا ہوا کارٹون تھا۔ اُن کی ٹھٹھے بازی زٹلی چھترے تھے جو مونہوں سے نکل کر میرے دِلّی کے دلدادہ دل پر تابڑ توڑ برس رہے تھے۔ اتنے میں ڈیوڑھی کے سامنے

کا در بند کھلا۔ پہلے ایک بوڑھی نوکرانی اور اس کے پیچھے قدرے سانولے رنگ کے ایک شریف آدمی جن کے چہرے پر داڑھی تھی، نکلے اور مجھ سے پوچھا: "برخوردار کیا چاہتے ہو۔ کون ہو؟ کس کو پکارتے ہو؟" میری وضع قطع، اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسے ثقہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ لے آئے گی۔ میں نے ارد گرد کے شور و غوغا کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا:

"میں ڈپٹی صاحب سے تَوْبَۃُ النَّصُوح بننے آیا ہوں۔ یہ بننے آیا ہوں" نہ جانے کیوں میرے منہ سے نکلا کہ وہ ہنس دیئے اور نرم لہجے میں جو کچھ فرمایا وہ میری سمجھ میں صرف اتنا ہی آیا کہ "ڈپٹی صاحب تو ——" باقی میرے ارد گرد کے جھرمٹ میں غائب غلّہ ہوگیا۔ وہ بزرگ دیکھتے ہی رہ گئے اور لڑکوں نے مجھے ڈھول دھپّے سے نوازنا شروع کر دیا۔ میں بھی ان کی طرف لپکا۔ مجھے دیوانہ سڑی گردانا گیا۔ اب میں آگے آگے اور لونڈے لاڑیئے میرے پیچھے پیچھے تھے۔ میں دھتکار کھایا ہوا تھا، دھکیا یا ہوا تھا۔ بڑیاں والے کٹڑے میں سے ہوتا ہوا تا جان بچا کر آخرکار کارونیشن ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھا۔ لڑکے نہ جانے کب تتر بتر ہوئے میں تو اپنے جھلنگے پر دراز تھا۔ اس کمرے میں جہاں ہم تینوں لڑکے ٹھہرائے گئے تھے۔ کمرے کی دو طرف کی دیواریں سفیدی کردہ چٹائیوں کی تھیں۔ آگے بالکنی تھی۔ بازار کی جانب اور کمرے میں داخل ہوتے کا دروازہ دوسری منزل کے صحن میں سے ہمیں اس کمرے میں لاتا تھا۔ اس وقت میرے ساتھی غائب تھے۔ یہ ہے شاہد احمد کے دادا کی حویلی کے پھاٹک اور ڈیوڑھی کے اندر تک میری حاضری کی اوّلین داستان۔

یہاں سے اس کے بعد میں بار بار گزرا — لیکن لباس اور وضع قطع الگ تھی ہائے. کیا عمدہ شعر شوق قدوائی مرحوم کا یاد آگیا ہے ۔ ؎

گلیوں گلیوں، ہم نے لاکھوں کنکر پتھر کھائے ہیں
لڑکوں نے دیوانہ پاکر ناک چنے چبوائے ہیں

میری یہ پہلی ملاقات شاہد احمد سے نہیں بلکہ اُن کے دادا جان کی بنوائی ہوئی حویلی سے تھی. اور ایک جھلک اُن کے والد ماجد کی بھی میں نے اسی عالم میں دیکھی تھی. یہ زمانہ وہ تھا کہ چاندنی چوک میں، اگرچہ اب خشک تھی لیکن شاہجہانی دَور کی نہر اور اس کے ہر دو جانب درخت موجود تھے. بجلی بھی بازاروں میں کھمبوں پر رات کو طرح طرح کے رنگ بدلتی تھی. ٹراموے بھی تھی، لیکن ہم یکے ہی کو ترجیح دیتے تھے. اور اسی میں قطب کی لاٹھ پر ہو آتے تھے.

آگے اور زیادہ لکھنا نہیں ہے. دلی نے بقول خواجہ حسن نظامی میرا دل لے لیا یا اپنے پنجے میں جکڑ لیا تھا. میں بار بار دہلی گیا. اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جن کی تلاش میں کوچہ بہ کوچہ، بتاشاں میں مجھے دیوانہ گردانا گیا تھا" وہ مدت ہوئی انتقال فرما چکے ہیں. تاہم ان کی کتابیں موجود تھیں، البتہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ شاہد احمد بھی کوئی صاحب ہیں. ہاں ایک دو مرتبہ اس بڑی حویلی کے پھاٹک پر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا، جس پر "ساقی بک ڈپو" لکھا ہوا تھا، اور بس۔

لیجئے میں شاعر بھی ہو چکا تھا ایڈیٹر بھی. دہلی کے مشاعروں ہی میں نہیں، خواجہ

مرحوم شاہد

حسن نظامی کے ہاں قوالی بھی سُنتا اور کوچہ چیلاں میں مولانا محمد علی جوہر سے آصف علی بیرسٹر کے درِ دولت پر نیاز بھی حاصل کرتا تھا۔ محترم مُلّا واحدی کے بالا خانے پر محفل بھی جمتی تھی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے تو مجھے مریض الملک ہی بنا رکھا تھا۔ لیکن سب سے بڑی دولت حضرت علّامہ راشد الخیری کا دیدار تھا جن کی تحریریں ہمارے گھریلو معاشرے کی مُنہ بولتی غم انگیز تصویریں ہیں۔ اگر ہم میں ذرہ بھر بھی غیرت ہے تو اپنے اللہ سے اور اس کے حبیبؐ سے ازسرِ نو رشتہ جوڑ کر اپنی اور اپنی آئندہ نسلوں کی تقدیریں بدلنے کے لئے نہ صرف پڑھنی چاہئیں بلکہ اُن کی تبلیغ بھی کرنی چاہیئے۔ ؎

آؤ نقشِ لا اُحِبُّ الآفلیں تازہ کریں
چشمِ ابراہیمؑ سے ذوقِ یقیں تازہ کریں
سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

شاہد احمد سے میری پہلی مُلاقات اُن دنوں ہُوئی جب میں دوسری جنگِ عالمگیر میں سونگ پبلسٹی کا ڈائرکٹر تھا۔ "ساقی" تو میری نظر سے میری ادارتِ "مخزن" کے زمانے ہی میں شاید گزر چکا تھا۔ لیکن مجھے مشاعروں سے، اسلامی جلسوں میں چندہ جمع کرانے، خلافت کانگرس کے تحاریکی جلسوں میں دلوں کو گرمانے کے بعد شدھی اور سنگھٹن کے مقابل ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی صلح پسندانہ تحریک میں تگ و دو سے فرصت کہاں تھی۔ "مخزن" سے "ساقی" کا تبادلہ بھی نہ تھا، البتہ

کبھی کبھار اپنے محترم دوست ایم اسلم صاحب سے "ساقی" مل جاتا تھا اور میں نے
جان لیا تھا کہ شاہد احمد دہلوی مدیر و مالکِ "ساقی" اور ساقی بک ڈپو ہماری قوم و
ملت میں اس فردِ وحید کے پوتے ہیں جن کی کتابوں سے میں نے اتنا کچھ سیکھا
ہے کہ مجھ ایسے کسی پنجابی اہلِ قلم نے کبھی نہ سیکھا ہوگا۔

شاہد صاحب سے ملاقات کی صورت ادبی نہیں تھی۔ مجھے دعوت ملی۔ ایک
دوسرے دوست جو ریڈیو میں ملازم تھے۔ مجھے اُسی گلی بتاشاں والی میں لے گئے
اور میں اُسی پھاٹک کے اندر کی ڈیوڑھی سے سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایسی محفل
میں در آیا تھا جس کے میزبان شاہد احمد تھے۔ یہ جلسہ موسیقی کے ایک بہت بڑے
اُستاد کا فن، سماعت کرنے کے لئے سجایا گیا تھا۔ اس لئے میں ——
ابوالاثر حفیظ جالندہری —— گیت اور نغمہ وغیرہ سے نازیوں کے خلاف سارے
ہندوستان میں پبلسٹی کرنے والا ڈائریکٹر بھی اس محفل میں سج گیا۔ مجھے شاہد احمد
سے مل کر ایسی مسرت ہوئی جو ایک عقیدت مند مرید کو اپنے پیرزادے سے مل کر ہو سکتی ہے۔
رات کے دو بجے تک یہ محفل جمی رہی۔ وہ استادِ موسیقی جن کا نام نامی بھول گیا ہوں
واقعی بہت بڑے اور کامل تھے۔ مجھے اس رات یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شاہد احمد
بھی اس فن میں اُستادی کا درجہ حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن میری بدنصیبی کہ مجھے اُن
سے کوئی راگ، راگنی سننے کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ بات یہ تھی کہ مجھے اُن کے
دادا کی کتابوں اور ان کے والد کی جھلک نے اپنا ایسا نیاز مند رکھا تھا کہ شاہد احمد
کو دیکھ کر ڈپٹی صاحب اور ان کے والد کی تصویریں سامنے آجاتی تھیں وہ تھے
جیّد عالم و ادیب، لہٰذا یہ ممکن ہی نہ تھا کہ میں کبھی ان کے وارث سے راگ

سُننے کی فرمائش کروں۔ میرے نزدیک، یہ گستاخی تھی۔ اگرچہ وہ عُمر میں مجھ سے چھوٹے تھے، لیکن بزرگ زادے تھے!

جب شاہد احمد پاکستان آگئے تو میں ان دنوں پہلے محاربۂ کشمیر میں اور پھر افواجِ پاکستان میں تبلیغِ شجاعت کی خدمت پر مصروف تھا۔ شاید اسی دوران ایک دوست نے مجھے "ساقی" کا شمارہ بھیجا جس میں ڈاکٹر تاثیر کے ایک نئے ملاقاتی نے اُس "مرحوم" کی کسی ادا پر خفا ہوکر ان کو "ساقی" کے صفحات پر بے نقط سنائی تھیں۔ ایسی بے نقط کہ میں اَلحفیظُ کا وِرد کرنے لگا۔ اور تاثیر کو، ان باتوں کا کسی طرح سے بھی جواب دینے سے منع کیا ـــ تاثیر، اُن دِنوں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ مجھے ایسے بزرگ زادے کے رسالے میں گالی گلوچ پسند نہ آئی تھی۔ اگرچہ یہ شاہد احمد کی طرف سے نہ تھی لیکن وہ اس مجلّہ کے مدیر تو تھے۔ میرا اپنا ہی شعر اس وقت میرے ذہن سے کہہ رہا ہے کہ جو کچھ تو نے اوحفیظ، تاثیر سے کہا تھا یہاں بھی کہہ ڈال۔ وہ شعر یہ ہے ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

شاہد احمد ایک دن مجھے کراچی کے ایک دفتر میں ملے۔ اغلباً اُس وقت میرے ساتھ میرے زندہ دل دوست اے ڈی اظہر تھے۔ میرے نیازمندانہ سلام کا جواب خندہ پیشانی سے ملا تو میں نے پوچھا:

"شاہد بھائی، اِس دفتر میں کیسے آنا ہوا؟" وہ مسکرائے اور جواب دیا:

" ریڈیو پاکستان میں، نوکری کے لئے آیا ہوں "

" نعوذ باللہ " میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں نے اظہر بھائی سے کہا : " دیکھتے ہو، شاہد احمد دہلوی شمس العلماء ڈپٹی حافظ نذیر احمد مدظلہ العالی کا پوتا، شریف زادہ ہی نہیں دہلی کا رئیس زادہ، خود ایک بہت بڑے کتب خانے کا مالک اور بہت بڑی جائداد کا وارث، آج یہاں نوکری کے لئے دفتر دل کے چکر لگا رہا ہے۔ " یعنی اختیارِ خود بدستِ خود فروختن کے لئے مجبور ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور رخساروں پر ٹپک پڑے جنہیں میں نے منہ پھیر کر اپنے رومال سے پونچھا۔ شاہد بغلگیر ہوئے اور چل دیئے۔ ع

بڑی مصیبت شریف کو ہے امیر ہو کر غریب ہونا

پاکستان کا رائٹرز گلڈ بنا۔ جناب قدرت اللہ شہاب سے زیادہ شاید اور کوئی نہ مانے کہ آغاز میں اس کا محرک میں تھا، اور ان کے سرکاری دفتر میں پہنچ کر ان کو اُکسایا کرتا تھا اور پھر جب میں " ایفرو ایشین " کانفرنس تاشقند اور رُوس کی سیاحت سے پلٹا تھا تو میں نے ہی شہاب صاحب سے وہاں کے اہلِ قلم کے اتحاد کی داستانیں سنائی تھیں۔ آخر کار یہ طے ہُوا کہ اہلِ قلم کی عزت و حُرمت کے لئے کچھ کیا جائے۔ بہت سے نام پیش ہوئے۔ ایک مضمون عالی صاحب کے کہنے پر افتتاحیہ کے طور پر میں نے لکھا۔ ایک چھوٹی سی مجلسِ مشاورت میں میرے پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پاکستان رائٹرز گلڈ منظور ہو گیا۔ ضروری نہیں اور میں خواہشمند بھی نہیں کہ اس کا اعتراف کیا جائے

بلکہ اس لئے ہے کہ اگرچہ میں اہل قلم کی عزت طلبی کرنے والوں کے اوّلین شرکا میں سے ایک تھا۔ لیکن الحمدللہ کہ میں نے نہ کسی عہدے کی خواہش کی اور نہ انشاء اللہ آخری سانس تک یہ تمنا کروں گا۔ البتہ اہلِ قلم کی خدمت میرا فریضہ ہے جس کا ثبوت میں سونگ پبلسٹی کے زمانے میں بھی دے چکا ہوں ——

جہاں تک گلڈ کا تعلق ہے، میری خدمات کے سلسلے میں شاہد احمد میرے شاہدِ عادل ہیں۔ ان کی ایک تحریر مشہور و معروف مجلہ "افکار" کے حفیظ نامے یا حفیظ نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں چند باتیں ایسی بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میرے اصل حالات سے قطعاً ناواقف رہے تاہم میرے خلوص، میری نیاز مندی اور ان کے ارشادات کی جو تعمیل راقم الحروف نے گلڈ میں کی اس کا صدقِ دل سے شاہد احمد نے اعتراف فرمایا ہے۔ اور میں تو بہرحال تھا ہی اُن بزرگ زادہ صاحب کا نیاز مند۔ اب بھی ہوں اور آخری سانس تک رہوں گا۔ عقیدتیں، محبتیں کسی کے جسمانی طور پر جدا ہو جانے سے ختم نہیں ہو جاتیں۔ ہاں، میں جانتا ہوں کہ زمانہ بدل گیا ہے اور میں نے موجودہ صورتِ حال کو ایک شعر میں بیان بھی کر دیا ہے۔ سے

جان سے پیارے یار ہمارے قیدِ وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تارِ نفس کی بات نہیں

"ساقی" کا ایک شمارہ راولپنڈی میں نظر سے گزرا۔ اس پر شاہد احمد دہلوی کے بجائے عاصمہ (خاتون کا نام) بطور ایڈیٹر تھا، اور محترمہ کی طرف سے یہ اندیشہ ناک خبر تھی کہ شاہد صاحب پر دل کی تکلیف کا دورہ پڑا ہے۔ یہ خبر پڑھ

کر تو دمیرا دل میرے حلق میں اٹک گیا۔ مجھے اُن سے بہت زیادہ محبت تھی میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سطور ان کی بیگم صاحبہ نے لکھی ہیں۔ میں نے ایک خط محترمہ کی خدمت میں لکھا اور اپنی انتہائی تشویش کی حالت میں لکھا۔ چند روز بعد خود شاہد احمد کے اپنے قلم سے تحریر شدہ خط مجھے ملا، جو افسوس اِس وقت میرے ساتھ لاہور میرے بستے میں نہیں۔ راولپنڈی میں چند ایسے خطوط کے ساتھ رکھا ہے جن کو میں تعویذ خیال کرتا ہوں اور مقبولؔ جہانگیر کا اصرار شدید ہے کہ میں اس وقت جس عالم میں بھی ہوں، جو کچھ لکھ سکوں لکھ کر ان کی خدمت میں پہنچادوں، اس لئے وہ خط تو یہاں پیش نہیں کرسکتا بس یہ جان لیجئے کہ یہ خط شاہد بھائی کا پہلا اور آخری خط میرے لئے ہے۔ اور میں اسے دو عالم سے زیادہ عزیز جانتا ہوں۔ ؏

نامراشِ نامۂ حیات بہ من ست

چند دنوں کے بعد میرے بیٹے ابنِ الشاد نے مجھے بتایا کہ شاہد احمد دہلوی کا انتقال ہوگیا۔ اس منادی سے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میں نے نہ جانے کیا کہا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے منہ سے نکلا: "آج میرے لئے دہلی مرگئی۔" پھر آنکھیں تھیں کہ آنسو نہ رکے۔ اور میں سر جھکا کر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ آخر مجھے اپنا ہی شعر یاد آیا ؎

میرے دوستوں کی صدا آ رہی ہے
تری راہ اہلِ عدم دیکھتے ہیں

اِس وقت رات کے تین بج چکے ہیں۔ تحریر کی بے ربطی میری اپنی

مرحوم شاہد

دماغ باختگی کی مظہر ہے۔ آج دوپہر جناب معقول جہانگیر نے شدید اصرار کیا تھا کہ جو بھی اور جیسا بھی لکھا جا سکے لکھ بھیجوں۔ اب اور ہمت نہیں، دوبارہ اپنا ہی لکھا ہوا پڑھا نہیں جا رہا۔ کٹوتی ہر سطر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ اپنے آغازِ شاعری کا مطلع لکھ کر مقطع بننے پر مجبور ہوں۔

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں
مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

کامیاب زندگی

ایک کالجی پروفیسر نے چند مشاہیر سے کامیاب زندگی کے سوال کئے تھے۔ میری شہرت پر کامیابی کا گماں کرتے ہوئے نثر میں ان سوالات کے جوابات لکھنے کا مجھ سے بھی ایما تھا۔ چونکہ میری آپ بیتی کی فرمائش تھی۔ مَیں نے آغاز کیا تو کامیاب زندگی کے موضوع نے شیطان کی آنت بن کر بھولی بسری یادوں کو لپیٹ لیا۔ مقالے نے کتاب کی صورت اختیار کر لی، جو ابھی تک تکمیل کا مُنہ نہیں دیکھ سکی۔ ذیل کی سطور اس کتاب کی تمہید ہے جو میری زندگی کی مانند بے ربط نظر آئے گی۔۔

مجھ سے پوچھا گیا ہے۔ کامیاب زندگی کیا ہے؟ کامیاب زِندگی کِس نے بسر کی ہے؟

یہ کٹھن سوالات ہیں۔ فیلَسُوف مفکرّین کے سوا اِن سوالوں کا جواب کون دے۔ مَیں یہ باتیں کیا جانوں۔ مجھے کیا معلوم ہے۔ مَیں تو ؎

شاعر ہوں مرا کام نہیں فلسفہ رانی
کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی

اس دُنیا میں اکتر سے زائد برس ہونے کو آئے۔ لاکھوں ہزاروں آدمیوں کو دیکھنے، ملنے جلنے اور سینکڑوں سے شیر و شکر ہو جانے کا شرف حاصل رہا۔ میری تو ایسے کسی خوش بخت سے ملاقات نہیں ہوئی جس نے اپنے مُنہ سے اپنی ساری زندگی کے بارے میں کامیابی کا دعویٰ یا اعتراف کیا ہو۔

اس کے برعکس ایسے بہت دیکھے جن میں سے کسی ایک کو مثلاً زید کو اگر یہ شبہ بھی ہو جائے کہ اس کی زندگی کسی اچھے خاصے خیر طلب دوست کو (بھی) کامیاب نظر آ رہی ہے۔ یا ایسا سُوءِ ظن رکھتا ہے تو زید سٹ پٹا جاتا ہے۔ کبھی سلیقے سے۔ اکثر اوقات بے سلیقگی کے ساتھ ایسی شکل بناتا ہے، ایسی آپ بیتیاں سُناتا ہے جن سے ثابت ہو کر دنیا بھر کے انسانوں میں اکیلا یہی ایک انتہائی بے چارہ، مظلوم، آفت دیدہ، غم رسیدہ، اندوہ گیں اور ناکام ترین فرد ہے۔ اور اس کو ناکام رکھنے کے لئے زمین و آسمان، شیطان اور انسان سب نے سازش کر رکھی ہے۔ اور "رحمٰن" تو ہے ہی بے نیاز۔۔۔!

ہمارے سارے معاشرے کی صورتِ حالات مجھے کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے۔ گویا کامیاب ہونا اور کامیاب سمجھ لیا جانا کسی بڑے ہی خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ کوئی ایسا شرمناک فعل اور گناہ ہے جس کا اعتراف کر لینے سے مرگ و ہلاکت نہ سہی مُنّہ دکھانے کے قابل رہنا کسی بھی صورت ممکن نہیں۔

دوسرے افراد کو کامیاب جان کر رشک فرمانے والے تو بے شمار ہیں، خود راقم الحروف کو بھی بہت صورتوں پر رشک آتا رہا ہے لیکن معتاً جب وہ پیشانی جو قابلِ رشک گردانی گئی تھی، قریب سے نظر آئی تو اس پر ڈھیروں گرد

کدورت بھی ہوئی پائی۔

اگر کامیاب زندگی کسی فرد کی ذاتی تمناؤں اور آرزوؤں، امنگوں کے پورے ہو جانے یا مسلسل پوری ہوتی چلی جانے سے عبارت ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ انسانوں میں کوئی بھی ایسا عالی ظرف نہ ملے گا جو اپنی زبان میں درد انگیز لہجے کے ساتھ یہ نہ کہہ رہا ہو ؎

وہ بھی ہوگا کوئی اُمّید بر آئی جس کی
اپنا مطلب تو نہ اس چرخ کہن سے نکلا

واللہ میں نے ایسے بہت دیکھے ہیں کہ اگر ان کو کامیاب حیات کا خطاب پیش کیا جائے تو وہ اسے الزام سمجھتے ہیں۔ اور ایک طرز بیزاری سے باچھیں اوپر کو سکیڑ کر مسکرا دیتے ہیں۔

ممکن ہے یہ میری آنکھوں کی خطا ہو۔ بہر آئینہ میں نے تو زندگی کے بارے میں کسی کو مطمئن نہیں دیکھا۔ شاید مطمئن نہ ہونا ہی ابنِ آدم اور بنتِ حوّا کی زندگیوں کا مقصودِ موعود ہے۔ اگر یہ بات ہے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ انسان جو اپنی ذات کو ناکام پاتا ہے، کامیاب ہے۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ چند انسان جھجکتے ہوئے شاید اعتراف کر گزریں کہ فلاں کام کر لیا۔ وہ ارمان نکال لیا۔ لیکن ایک دو خواہشوں کا پورا ہو جانا تو ساری زندگی کی کامیابی نہیں کہلا سکتی۔ غالب نے کیا خوب اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ ؎ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مجھے کہنا یہ ہے کہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آدمی بقائمی ہوش و حواس اپنی زندگی کامیابی سے گزارنے کا اقرار کرنا چاہتا ہی نہیں — یا کر ہی نہیں سکتا۔ اور اقرار سے یہ گریز، یہ اقرار نہ کرنا اور نہ کر سکنا ہی تو ثبوت ہے اعترافِ ناکامی کا۔

کسی ایک فن میں کامیاب رہنے کے سلسلے میں مجھے اپنے ہمعصر تعلّی باز شاعروں یا ادیبوں کے سوا کوئی ایسا نظر نہیں آیا۔ یعنی ایسا صاحبِ فن بھی نہیں دیکھا جس کو اگر سنجیدگی کے ساتھ یہ کہہ دیا جائے کہ آپ اپنے فن کی تخلیق میں بھی کامیاب ہیں اور اس کی تحسین میں بھی۔ تو وہ جو کچھ بے حسرت فرماتا ہے اس کو سننے سے داد دینے والا خود شرما جاتا ہے۔ البتہ ہم لوگوں یعنی شاعر کلاس میں ایک خاص طریقِ شکر و سپاس ضرور رائج ہے وہ یہ کہ آپ اگر مجھ سے تنہائی میں یہ بھی کہیں کہ واللہ آپ کا تو ہر شعر ایسا کامیاب تاثر دار دکرتا ہے کہ باید و شاید۔ تو میں جھکوں گا۔ داہنا ہاتھ سر کی طرف اٹھاؤں گا، پیٹنے کے لیے نہیں محض آداب عرض فرمانے کے لئے، اور میرے منہ سے بے ساختہ یہ روایتی الفاظ آپ سُنیں گے کہ واللہ آپ ہی ہیں جو میرے واقعی قدر دان ہیں۔ آپ نے انصاف کیا ہے مجھ عاجز کے ساتھ ورنہ — !" اور اس ورنہ کے بعد۔ معاذاللہ — !

اگر صورت حالات کم و بیش یہی ہے، تو پھر کس طرح یہ معلوم کیا جائے کہ زندگی میں کامیابی کسے نصیب ہوئی ہے۔ مجھے اُس کا ایک اور آسان ذریعہ سُنا ہے : اس ذریعے کا نام لیا گیا ہے۔

"زبانِ خلق" کا سراغ لگانے کے لئے ان لوگوں کی رائے ملاحظہ فرما لیجئے جن کے درمیان ایک آدمی زندگی گزارتا ہے۔ یہ ہے وہ رائے جسے زبانِ خلق ہی نے نقارۂ خدا بیان فرما رکھا ہے۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

کی تلقین تو مدت سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ یہاں اس امر کو اپنے اطمینان کے لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ زبانِ خلق محض آدم زاد ہی کو "خلقِ خدا" ہونے کا شرف بخشتی ہے۔ کائنات کی دوسری مخلوقِ خدا کی شہادت کو اس "نقارۂ خدا" نے قطعاً خارج از بحث ہی نہیں، خارج از ذکر ہونے کی بھی منادی کر رکھی ہے جیسے کسی اور مخلوق کا وجود ہی نہیں۔

چلئے یہ بھی اچھی بات ہے۔ ہم یقین کئے لیتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی موجود ہی نہیں۔ کوئی ہر چند کہے کہ "ہے"۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ "نہیں ہے" اور اگر واقعی جہیر الصوت نقادوں منادوں کی آوازِ بازگشت اور رٹی ہوئی قطار پر اپنی زندگی گزارنے والوں میں سے کسی ایک کی یا چند ایک کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے تو کامیاب زندگی کو جان لینے، پہچان لینے کا معمہ بہت آسانی سے حل ہو جاتا ہے اور "زبانِ خلق" ہی نے اسے حل کر بھی رکھا ہے۔

حل اس طرح کہ زبانِ خلق کو بہت ہی بلند آہنگ "نقارۂ خدا" ثابت کرنے کے لئے ناکام انسانوں نے بڑی بڑی کامیاب ترکیبیں اختیار کی ہیں۔ جن میں سب سے کامیاب "ڈیموکریسی" ہے۔ یعنی کسی غلط بات کو درست

بتانے کے لئے سَو میں سے اکیاون آدمی شور مچائیں تو ماننا پڑے گا کہ غلط ہی درست ہے۔ باقی اُنچاس کی بات واہیات قرار پاتی ہے۔ لہٰذا یہ سَو میں سے اکیاوَن جس فرد کی زندگی کو بھی کامیاب اور قابلِ تقلید ہونے کا ریزولیشن پاس کردیں وہ فرد تو زندگی کے امتحان میں پاس ہوگیا۔ جس کو بھی یہ زبانیں نقارۂ خدا کی منادی کے بل پر کامیاب ٹھہرادیں۔ اس کا فرمان واجبُ الاذعان جاننا پڑے گا۔ وہ کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو اس کی زندگی کو دوسروں کے لئے منزل کامیابی پر لے جانے والی "قافلہ سالاری" کا اہل تسلیم کرلینے ہی میں عافیت ہے ورنہ بے بھاؤ کی کچھ چیزیں بغیر خریدے سر پہ آپڑیں گی۔

آئیے اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یہ "زبانِ خلق" ہے کیا بلا؟ جسے نقارۂ خدا ہونے کا اعلان شیطان نے نہیں خود انسان نے کر رکھا ہے۔ اچھے خاصے تجربے اور تحقیق اور تفتیش کے بعد میں تو اسے بابل کا مینار ہی پاتا ہوں۔ زبانِ خلق چھوٹے چھوٹے بڑے بڑے جتھوں میں بٹی ہوئی ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔ جس کے قبضے میں بھی چرب زبانی کی قینچی ہے اس نے آنکھوں پر چربی چڑھائے ہوئے گروہوں کو آگے لگا رکھا ہے۔ یہ سب گروہ الگ الگ اپنی اپنی ہمارتی بولتے ہوئے کچھ مدت زبانِ خلق بنے رہتے ہیں کچھ مدت بعد ٹوٹتے ہیں۔ ٹولیوں میں تقسیم ہوکر اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ الاپتے اور گاتے ہیں۔ پھر گم شدن۔ جس طرف دیکھو نقار خانے ہی نقار خانے ہیں۔ ہر نقارے پر مسلسل ضرب

پڑ رہی ہے۔ ایک نقارے پر ایک نئی گھڑنت کا کامیاب انسان گونجتا ہے. اور دوسرے نقاروں کی گونج میں دوسرے کامیابوں سے ٹکرا کر گم ہو جاتا ہے.

اب لیجئے یہ سوال کہ کامیاب زندگی کیا ہے ؟

اگر زبانِ خلق کو "نقارۂ خدا" سمجھ کر آمنّا و صدقنا کہہ دینا اس سوال کا جواب ہے ۔ تو اس "نقارہ گردی" کے اَدوار میں کرۂ ارض آرزوؤں کا ایک بڑا قبرستان بنا ہوا دیکھ لیجئے اور ملاحظہ کیجئے کہ دنیا کامیاب انسانوں کی سفید چونے گچ قبروں سے معمور اور اندھوں کے لئے نورٌ علیٰ نور نظر آتی ہے یا نہیں.

زبانِ خلق نے ہر قبر پر نوبت بجا بجا کر ہر دَور، ہر زمانے میں اپنی اپنی ذہنیتوں کے پیشِ نظر بہت سے آدمیوں کو کامیاب بتایا اور اپنے زورِ بیان سے بنایا بھی ہے. کامیاب زندگیوں کی اتنی متضاد مُورتیں گھڑ کر سجا دی گئی ہیں کہ اس نگار خانے میں سب تصویریں ایک دوسرے کا مُنہ چڑاتی دکھائی دیتی ہیں. مَیں نقار سازی کے اس نگار خانے کے مجموعۂ تضاد پر حیران ہوں اور اپنے اس شعر کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

یہ خوب کیا ہے یہ زِشت کیا ہے، بشر کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

بہت سے چور، سینہ زور۔ بے شمار ڈاکو، ہلاکو۔ حکایتوں، روایتوں، رسموں رِیتوں میں گیتوں کے ہاتھوں کامیاب زندگی کے تاج پہنے ہوئے انسانی ذہنوں میں جابجا ہیں، اکڑے ہوئے کھڑے ہیں، اکڑوں بیٹھے ہیں. ان میں زیادہ تر معرکۂ زندگی کے بہت سے فراری ہیں۔ جن کی ناکام زندگی کو کامیاب دکھانے

کے لئے "زبانِ خلق" نے کامیاب نقارہ بجایا ہے۔

"نیستی" کی بے شمار ہستیاں رنگارنگی ڈنڈوتوں کے ساتھ پوجی جا رہی ہیں۔ ہڈیوں پر پھولوں کی بارشیں ہیں، جہاں ہڈیاں نہیں مل سکیں پتھروں کو ہڈیوں کی شکل دے دی گئی ہے۔ انسان نما جانوروں کے سر ہیں کہ جھکائے جا رہے ہیں۔ انبوہ انبوہ اور گروہ گروہ انسان دُور دُور سے کامیابی کے ان مُردہ دیوتاؤں کے حضور ماتھا ٹیکنے اور بھوگ چڑھانے کے لئے رواں دواں ہیں۔

اس زبانِ خلق نے زیادہ تر ایسے واقعات کامیاب زندگی کی موجودگی کے ثبوت میں زبان زدِ عام کر دیئے ہیں جن کو عقلی اور عملی زندگی تسلیم کرنا نہیں چاہتی جن لوگوں نے سرے سے زندگی کی ہی نہیں، ان کو کامیابی کا پُتلا بنا کر اور بانس پر چڑھا کر انسانی گروہ ایک دوسرے کے خلاف آگے بڑھ رہے ہیں بے چارے "عمل" اور بے چاری "عقل" کو چُپ سادھ لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

زبانِ خلق کی گوناگونی کو پُستکوں اور کتابوں کی شکل دے دی گئی ہے۔ کتاب پر کتاب، اینٹ پر اینٹ رکھی جا رہی ہے۔ یہ رام لیلا کے دُسہرے ہر جگہ نئی سے نئی وضع قطع کے ہیں۔ راون کا تو ایک سر گدھے کا دکھایا جاتا ہے لیکن مجسمے سینکڑوں، ہزاروں گدھوں کے سروں پر ایک ایک انسانی سر بنائے گئے ہیں۔

کہانیاں، داستانیں، روائتیں، حکائتیں سچ ہیں یا جھوٹ، مجھے اس کے بارے میں اور کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ میں تو ابھی تک یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر بنی آدم اعضائے یک دیگر ہیں اور ان کی آفرینش ایک ہی جوہر

سے ہے تو انسان کی منزلِ مقصود بھی ایک ہی ہونی چاہیے تھی لیکن مجھے تو
کامیابی کی منزل کے تصورات بہت متضاد دکھائے گئے اور دکھائے جارہے
ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی انسانی معاشرے نے اس ایک منزل کا تصور ہی
منظور نہیں کیا۔ جس کو وحیٔ خداوندی نے انسانیت کی منزلِ مقصود بتایا ہے۔

افسانوی کامیابیاں

انسانی افراد اور جماعتیں محض تفریحی طور پر اس کیفیت کو ڈھونڈنے
کی سعی میں ہیں۔ جس کو اطمینانِ قلب کہتے ہیں۔ اطمینانِ قلب ہی کامیابی ہے
اس کامیابی کی خوش وقتی یا خود فریبی کے لئے انسان جھوٹے افسانوں
کے ڈھیر، ٹیلے، ٹبے، مینار، کہسار بنا چکے، بنا رہے ہیں۔ ایک کو دوسرے
کے بوجھ تلے دباتے چلے جارہے ہیں۔

محیر العقول کشف و کرامات کو خرافات کہنے والوں کی بات چھوڑیئے
نفسیات کے اُن فرمودات کو ملاحظہ فرمائیے جن کو افسانہ سازی کے رنگ
میں حقیقت طرازی کے دعوے سے روایتی یا جدت فرمائی ہوئی "نیک نیتی"
کے ساتھ مدون کیا گیا ہے۔ دیکھئے ان سوانح حیات کو جن کا مقصد یہ بیان
ہوا ہے کہ لیجئے ہم نے نوعِ بنی آدم کو کامیاب زندگی کی منزل تک پہنچانے
کے لئے دانندگانِ منزل رہنما مہیا کردیئے ہیں۔

آپ اس سے درگذریئے کہ لکھنے والوں نے زبانِ خلق کو ملحوظ رکھتے
ہوئے تھوڑے سے سچ میں "نیک نیتی" کے ساتھ کتنا بہت سا جھوٹ
شامل کر رکھا ہے۔ معلوم یہ کیا جائے کہ اس دروغِ مصلحت آمیز نے کونسی

ایسی راہ دکھائی ہے جس سے واقعی کوئی اطمینان کی منزل پر پہنچ گیا ہو یا پہنچ سکے گا۔ کونسی منزل ایسی متعین کی ہے جس پر پہنچ کر چند ایک نہیں، نوعِ انسانی کا ہر فرد اپنی ذات کو کامیاب پائے گا۔

دوسروں کے ذکر پر آگے چل کر شاید جسارت کر سکوں، اس گھڑی تو اعتراف کرنا ہے کہ ایک منزل کو سامنے دیکھ کر چل کھڑے ہونے والوں میں سے میں خود بھی ایک ہوں — میں نے بھی کامیاب زندگی کے لئے تگ و دو کی ہے۔ اور میرا شعر زبانِ حال سے اس تگ و دو کا نتیجہ بتا رہا ہے ؎

بلندی پر اُٹھائی تھیں نگاہیں یہی تھی اوّلیں اُفتاد میری ۔

شعر و شاعری کی "جھوٹ سچ" سے الگ ہو کر میں نے جب کبھی اپنی تگ و دو کا محاسبہ فرمایا تو یہی پایا کہ اگر زندگی کسی ایک مقصد کو حاصل کرنے یا بہت سے مقاصد کو لے کر چلنے اور سب میں نہیں تو صرف ایک ہی میں کامیابی کا سہرا باندھ کر دولھا میاں کہلانے کا نام ہے تو مرتے وقت ہو یا حشر کے دن۔ اپنا حساب تو صاف ہے کیونکہ آغاز ہی سے ۔ ؎

مری کیا پوچھتے ہو قافلے کے ساتھ میں بھی ہوں
وہ رہرو ہوں کہ جس کا اک ہجُومِ غُول رہبر ہو

چونکہ دوسروں کے بارے میں "زبانِ خلق" نے جو کچھ نقارۂ خدا بن کر حتمی "فرمان" کے ساتھ ارشاد فرما رکھا ہے اس فرمان پر دوسروں کی گمراہی بیان کروں تو شاید نقارہ نوازوں کی خفگی حاصل کروں گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ دوسروں

کے بارے میں ظن و گمان کسی نتیجے پر پہنچا بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا اگر کوئی سچ بولے یا بول سکے تو وثوق کے ساتھ اپنی ہی ذات کو پیش کر سکتا ہے اور چونکہ میری ہی کامیاب زندگی کے بارے میں پوچھا گیا ہے اور میں جواب میں اپنی ذات کو پیش کرنے پر مجبور ہوں۔ تو اب اگر آپ بھی اِن سطور کو پڑھنے پر مجبور ہو جائیں تو کامیاب زندگی کی تلاش میں میری یہ تحریر آپ کے لئے مفید تو ثابت نہ ہوگی البتہ تفنّنِ طبع کا باعث شاید بن جائے۔ آپ کو ہنسی بھی آئے گی اور مجھ کو بے وقوف گھامڑ وغیرہ کہتے وقت اگر آپ میں سے کسی کی مونچھ موجود ہے تو اسے تفاخر کے ساتھ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کے ساتھ مروڑنے کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔

اگر ایسا ہو تو میں اسے اپنی سب سے پہلی، سب سے آخری اور سب سے بڑی کامیابی سمجھوں گا۔ یعنی ناکام کامیاب زندگی کے لئے ایک سَند۔

کہہ چکا ہوں کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے اپنے اِرد گِرد کے انسانوں کی دنیا میں کسی کو بھی اپنی کامیاب زندگی کے جُرم کا "مُقر" نہیں پایا۔ البتہ کہانیوں، افسانوں اور سوانح لکھنے والوں نے جو بے شمار شاہراہیں کامیاب زندگی کی تیار کر رکھی ہیں۔ انہی میں سے چند ایک کو میں نے بھی اپنی گامزنی کے لئے منتخب کیا تھا۔

آیئے اگر غور و فکر کی صلاحیت کو فرصت ہو تو ملاحظہ فرمایئے۔

ہر فردِ بشر کے سفرِ حیات میں۔ آغاز قصّہ کہانیوں اور تاریخی کارناموں کو بطورِ مشعلِ راہ رکھا جاتا ہے۔

کامیاب زندگی

بوڑھی دادی اماں یا دادا ابا کی سنائی ہوئی بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں اور جنوں، پریوں کی داستانوں کا تذکرہ جانے دیجئے جن کا تاثر میرا بچپن گذرتے جاتے کے ساتھ ساتھ گزرتا چلا گیا تھا۔ البتہ آج مجھے وہ ناول اور افسانے یاد آرہے ہیں جن سے بعض چند ایک کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر اپنی کامیاب زندگی حاصل کر لینے کے لئے گھر سے کئی مرتبہ بھاگ نکلا۔ کبھی چل چل کر خود پلٹ پلٹ آیا۔ کبھی پا بدستے دیگرے دست بدست دگرے اپنے تھان پر لا باندھا گیا۔ تھان یعنی اسکولی ٹٹوؤں کا باڑہ ــــــ!

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آغازِ حیات میں مجھے اپنے کنبے، گلی محلے اور شہر کے شاندار بزرگ، حاکم، اہلکار، کاروباری، سپاہی، وکیل، وکلا، مسجدوں کے ملا، امام، واعظ، مذہبی اور سیاسی رہنما زینہ بہ زینہ اور درجہ بدرجہ دلکش نظر تو آتے رہے لیکن ان کی تقلید کر کے ان ہی ایسا ایک بنتا کبھی میرے خیال کے ظرف میں نہ سمایا۔

مدرسے کے استادوں اور ہیڈ ماسٹروں پر نہ جانے کیوں مجھے رشک نہ آیا۔ ان سب کا رعب، تیچی کی ضرب کے سبب تعلیم گاہ کو دار الحرب تو میں نے ضرور مانا لیکن کبھی قابلِ تقلید نہ گردانا۔ کرکٹ کے کھلاڑیوں، تھیٹر کے ایکٹروں کے آگے پیچھے بلکہ اکھاڑے کے پہلوانوں تک کے گرد منڈلایا۔ لیکن ان میں سے کسی شوق کو اپنے گوں کا نہ پایا۔ بٹیریں لڑائیں، شکرہ داہنے ہاتھ پر بٹھا کر چند روز شکاری بن کر گھوما، کبوتر پالے اڑائے۔ لیکن ایسے شوق بس چند روز ہی راس آئے۔ ماحول میں بہت سے عملی طرزِ زندگی کے نمونے تھے،

لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی تھی کہ میرے سینے میں ان عالموں کا مثیل بننے کی آرزو پیدا نہ ہوئی۔ شاید ان میں میرے لئے کوئی عظمت نہ تھی۔ یا اس طرح کہہ لیجئے کہ یہ روزمرہ کی زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف درسی کتابوں میں کسی فرد کی ایسی زندگی کچھ ایسے اسلوب سے بھی مطالعہ میں نہ آئی تھی جس کو پڑھ کر میں اسی نہج پر چلنے اور آگے بڑھنے کی مشق کرتا۔ "پنڈت جی کی بیلی" اور "مولوی جی کے گھوڑے" نے مجھے اپنے پیچھے چلنے یا ساتھ ساتھ دوڑنے کی رغبت نہیں دلائی۔ البتہ مولوی صاحب کے گھوڑے، پنڈت جی کی بیلی نے پڑھنا سکھا دیا۔ ایسا کہ دلچسپ عبارتوں میں لکھی ہوئی داستانیں، ناول، افسانے شروع ہی سے میرے ہاتھ آنا اور زندگی کے سبز باغ دکھانا آغاز کر گئے۔

عام روزمرہ کی زندگی میں میرے لئے کوئی جاذبیت نہ ہونے کی وجہ کچھ یہی نظر آتی ہے کہ مجھے افسانے بھلے لگتے تھے۔ میرے اسکولی بستے میں خشک درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ، اپنی لذتیں اور سیر سپاٹے کی امنگیں لئے مطالعہ کا شوق دلانے کے یہی سامان رہنے لگے تھے۔ توتا کہانی، چہار درویش حاتم طائی، الف لیلہ وغیرہ کے علاوہ میرے عنفوانِ شباب کے دوران اُردو میں طبع زاد ناول بھی اشاعت پذیر تھے۔ جن کے مصنف اپنے اپنے ذہنی و فنی طول و عرض اور وضع قطع میں مختلف ہوں تو ہوں لیکن مقصود شرر کے تاریخی ناولوں اور توبۃ النصوح ایسے چند معاشرتی افسانوں سے قطع نظر سب کا تقریباً ایک ہی موضوع تھا۔ یہی۔ عاشق اور معشوق، کسی شریف گھرانے کی لڑکی کو دغا دے خود برباد ہو جانے اور اس بے چاری کو برباد کر ڈالنے کے سوا کچھ نہیں —!

آغازِ ناکامی

اُردو کے اِن طبع زاد ناولوں کا مجھ پر عملی اثر تو خیر میرے "جاندرو" (پیدائشی) روگ، یعنی شعر و شاعری کی رگ کو ذرا اور اُکسانے کے سوا کچھ بھی نہ ہوا۔ یوں بھی میرے بزرگ حافظ اور حاجی اور متشرّع لوگ تھے۔ شاید میں اپنے بزرگوں سے بغاوت کرنے کی سعادت حاصل کرتا لیکن میری بدنصیبی سے کوئی بھی صورت، کسی کواڑ کی آڑ، کسی منڈیر کی کھڑکی سے مجھ پر جھانکتی نظر نہ آئی تاکہ میرے دوستوں کو لخلخہ سُنگھانے اور مجھے چارپائی پر لاد کر گھر لانے اور پھر کسی کٹنی کو بلوانے اور اس جھرو کے والی ماہرُو محبوبہ کو ورغلانے کی ضرورت پڑتی۔

البتہ انگریزی سے ترجمہ کردہ ناولوں کے طفیل میرے ساتھ وہ معاملہ پیش آگیا جو کسی اُستاد شاعر نے پہلے ہی سے فرما دیا ہوا تھا۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

چلئے میرا اشہبِ زندگی تخیلی اور افسانوی سڑک پر بگٹٹ چل نِکلا۔ میری منزل تھی گمراہی — میں نے خود ہی تو کہہ رکھا ہے۔

بہت ہی مختصر ہے داستانِ گمرہی اپنی
قدم گھر سے نکالا اور منزل آگئی اپنی

اسلامی شجاعت : یہ درست ہے کہ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں نے میرے قلب میں اسلامی شجاعت کا عجیب جذبہ ضرور پیدا کیا تھا — لیکن یہ تاثر بہادرانِ اسلام کے کارناموں کو احترام اور فخر سے دیکھنے تک محدود

تھا۔ ان ناولوں میں بیان کردہ کارناموں کو میرا زمانہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب تلوار لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر عرصۂ حرب و ضرب میں در آنے اور غازی مردِ مجاہد بن کر پرے کے پرے صاف فرماتے چلے جانے کی میرے لئے کوئی راہ نہ تھی۔ لہٰذا جذبہ اُبھرا بھی تو شجاعت دکھانے سے قاصر رہ گیا۔ گھر سے بھاگ کر ایک رسالے "ٹوانہ لانسرز" میں بھرتی ہونے گیا۔ میرا گھرانہ توریوں کا راجپوتی افسانہ رکھتا تھا۔ لیکن میری عمر کم تھی۔ ابھی رنگروٹ بننے کی منظوری نہ ہوئی تھی۔ کہ دادا ابا گل مبارز خاں ٹوانہ رسالدار میجر کی دوستی سے فائدہ اُٹھا کر مجھے میرٹھ چھاؤنی سے گھر بلا لے گئے اور اسکول سے فرار کی داستان میری شجاعت بن گئی۔

افسانوی ہیرو :- کرنا خدا کا یہ ہُوا کہ میرے ہاتھ ایک ایسی کتاب آگئی جس کا نام تھا "الہ دین اور لیلےٰ"۔

یہ اُردو ترجمہ تھا ولیم رینالڈز کے ایک ناول "سٹار آف منگریلیا" کا یہ کہانی طولانی اور متعدد "تاریخ نما" افسانوی واقعات سے معمور تھی ــــ، گیارھواں برس۔ میری عمر ہی کیا تھی۔ اور پھر مجھے یہ بتانے والا بھی کون تھا کہ یہ محض افسانہ ہے حقیقت نہیں۔ میں اس عمر میں (واللہ) ان واقعات کو سچ سمجھا۔ اور یہ ہیں ایسے "سانچ جن سے میری زندگی کو آنچ ہی آنچ آئی۔

مصنف نے ناول میں سلسلہ ہائے کوہ قاف (کاکیشیا) کی نات میں ایک چھوٹی سی جنت الفردوس کا واقعی موجود ہونا دکھایا تھا۔ اور ساتھ ہی جیتے جی اس جنت میں داخل ہونے کا راستہ بھی بتایا تھا۔ میں نے اس کتاب

کو بار بار پڑھا اور یہ سمجھ بیٹھا کہ واقعی ایک ایسا فردوس ہماری اس زمین پر موجود ہے جس کی میرے سوا کسی کو اب خبر نہیں۔ اس ناول کے ذریعے خدا کی طرف سے مجھے یہ شرف ملا ہے کہ میں جا کر اس کی سیر کروں۔؟

یقین کیجئے کہ میرے خیال میں بھی یہ بات نہ آئی کہ اس کتاب کے اور بھی نسخے ہوں گے اور مجھ ایسے دوسرے تخیلی بہادر اطفال یا مردانِ پُرجلال نے بھی میری ہی طرح اس ناول کا مطالعہ کیا ہوگا۔

آہ اکہتّر برس کا ابھی تو میں جوان ہوں، اب بھلا کڑ ہو گیا ہے۔ مصنّف نے جن الفاظ میں اس وادی کی تصویر کھینچی تھی مجھے آج یاد نہیں میں تصوّر کے بل پر اپنی کج مج بیانی سے خود اختصار کے ساتھ وہ تصویر دکھاتا ہوں۔

یہ ایک وادی ہے چھوٹی سی۔ جس میں نہ موذی درندے ہیں نہ سانپ بچھو، مکھیاں ہیں نہ مچھر، نہ چوہے نہ گھونسیں نہ کھٹمل نہ پسو۔ اس چھوٹی سی وادی کے اِرد گِرد چاروں طرف برف سے لدے ہوئے پہاڑ ہیں۔ ایسے اُونچے ایسے اُونچے اور برف سے اتنے لدے ہوئے۔ اتنے لدے ہوئے کہ ہوائیں اُن کے قریب آتے ہی یخ ہو جاتی ہیں۔ بارہ مہینے رات دن برف باری فرماتی ہیں اس پہاڑی سلسلے کی سردی ایسی ہے کہ اپنے پیروں سے چلنے والے جانوروں میں آدمی تو کیا کوئی بکرا، ہرن، بارہ، شیر، چیتا، ریچھ بھی اس وادی میں چھلانگنے اور ہوا بازوں میں عقابِ فلک سیر بھی اس جنّت کے اندر پھلانگنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

لیکن اس کرۂ زم جزیرے کے بیچا بیچ یہ چھوٹی سی اچھوتی زمین ایک

ایسی حسین ترین نازنین ہے کہ مسلسل خوشگوار اور سدا بہار نے عمل انواع میں ہم قربان ہے۔ قدرت کی مرحمت شعاری اور قلم کاری نے اس کو کمالِ جمال کا شاہکار بنا رکھا ہے۔ نہ تو سرد ہوائیں اس کے اندر پہنچ کر کسی جسد کو کپکپاتی ہیں نہ آندھیاں آفت ڈھاتی ہیں۔ اس زمین کا ہر گوشہ گُل اندر گُل اور بہار اندر بہار ہے۔ صبا مدھم چال سے سرسراتی سبزے کو لہلہاتی ہے۔ بلبل کی صدا گلوں میں دھوم مچاتی ہے۔ ساز بجاتی ہوئی آبشاریں ہیں۔ نرم رَو خوشگوار اور خنک جوئباریں ہیں۔ جن پر نسیم پُر شمیم کی لہریں لہراتی اور سایۂ گلبن کے تحت رنگ رنگ کے نقش و نگار بناتی ہیں۔ کہیں آبِ گرم اور کہیں آبِ سرد کے چشمے اُبلتے ہیں۔ چٹانوں کے بطن سے جھرنے جھرتے ہیں۔ قدرتی فوارے اچھلتے ہیں۔ صبح و شام نت نئے چولے بدلتے ہیں۔ فرشِ پرزمردیں گھاس لہلہا رہی ہے۔ پیڑوں کی شاخ شاخ پر خوش الحان اور خوش رنگ چڑیاں گا رہی ہیں۔ شاندار اشجار جھومتے ہیں۔ خود رو جھاڑیوں میں خوش رنگ پھول، سادہ لوح معصوم کلیوں کے منہ چومتے ہیں۔ مور، چکور، قمریاں، لال گلال، مُرغ، تیتر، بٹیر کے علاوہ نہایت متین اور نڈر گائیں، بکریاں موجود ہیں۔ جن کا دودھ آسانی سے دوہا جا سکتا ہے۔ نیز موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والی ہرنیاں، لمبے لمبے سینگوں والے ہرن کلیلیں کرتے پھرتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہزاروں برسوں کے کسی قدرتی عمل نے یہاں کے پتھروں کو مرمر اور سنگ ریزوں کو لعل، ہیرے، جواہر بنا رکھا ہے۔ جو ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب اس فردوس میں کوئی انسان جیتے جی داخل ہو سکتا ہے یا نہیں
اس بارے میں ناول کے مطابق مشکل محض یہ ہے کہ اس وادی میں پہنچنا
عام ضعیفُ البُنّیان انسان کے بس کی بات نہیں. اس میں در آنے کے
لئے کھُل سم سم کی کوئی آواز نہیں. البتہ انسانی کاریگری ہی کا بنا ہُوا ایک
راز ہے. جو ہر دَور میں محض تین آدمیوں کو لازماً معلوم رہتا ہے.

ان تینوں میں جو بھی مرنے کے قریب ہوتا ہے وہ اپنے دوسرے دو
کی اجازت سے ایک خاص کردار کے مَرد یا عورت کو یہ راز بتا جاتا ہے.
ناول کے بیان کردہ زمانے میں (جو اس ناول کو پڑھتے وقت مجھے قریب
ہی کا زمانہ دکھائی دیا تھا) اس راز کو جاننے والا صرف ایک بوڑھا سوداگر
زندہ تھا. دوسرے دو رازدار اچانک مر گئے تھے.

طفلس یعنی گرجستان (جارجیا) کے دارالسلطنت کے ایک محل
میں رہنے بسنے والے اس بوڑھے سوداگر کا فرض تھا کہ اپنے دو عدد فوت
ہو جانے والے راز داں ساتھیوں کی نیّت اور وصیّت کے مطابق اپنی
موت سے پیشتر منگریلیا کی دوشیزہ شہزادی لیلیٰ کو اور قسطنطنیہ کے جواں
سال امیرزادے الہ دین کو (جسے ایک مشہور ترکی پاشا نے متبنیٰ بنا کر پالا تھا)
یہ راز بتا دے تاکہ اس بوڑھے سوداگر سمیت راز دار دنیا میں موجود رہیں۔
اور ان سب کو اگلے راز دار بنانے کے لئے بھی ایک خاص قسم کے کردار کی
تلاش بھی جاری رہے.

چنانچہ اس بوڑھے سوداگر نے ان دونوں کو پیغام بھیجا کہ بھیس بدل کر ایک

ہی روز ملک جارجیا کے دار السلطنت طفلس میں وارد ہو جائیں اور متعینہ تاریخ کو مجھ سے ملیں۔ تاکہ میں بھلے کی ایک بہت ہی راز کی بات تم دونوں کو بتا دوں:" یہ پیغام جس آدمی کے ذریعے بھیجا گیا وہ اس بوڑھے سوداگر کا ایک خانہ پروردہ غلام تھا۔ جسے سوداگر انتہائی وفاشعار نوجوان گردانتا تھا یہ غلام اپنے آقا کے اس راز سے تو واقف نہ تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اُسے شبہ تھا کہ بوڑھا آقا سوداگر کوہ قاف کے اندر کہیں نہ کسی خفیہ خزانے میں سے کچھ لینے کے لئے اپنے ایک خاص بوڑھے گھوڑے پر سوار ہو کر تن تنہا پہاڑوں کا سفر کیا کرتا ہے۔

اس "وفادار" ملازم نے قسطنطنیہ میں نوجوان الہ دین کو اور منگریلیا میں دوشیزہ شہزادی لیلےٰ کو سوداگر کا زبانی خفیہ پیغام پہنچا دیا کہ فلاں روز سوداگر دونوں کا منتظر ہو گا۔ ساتھ ہی ایک ایک انگشتری بھی سونپ دی۔ یہ انگشتریاں سوداگر نے اس لئے بھجوائی تھیں کہ جب یہ دونوں جوان مرد اور عورت (جو خود بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے) سوداگر سے طفلس آکر ملیں تو سوداگر جان لے کہ یہ دونوں وہی اصل افراد ہیں، جو مطلوب ہیں۔ کیونکہ سوداگر نے ان کو اور ان دونوں نے سوداگر کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن کہانی میں ہوا یہ کہ جب غلام سوداگر کا پیغام پہنچا کر پلٹا تو اس کو اپنے آقا سے بے ایمانی کی سوجھی۔ اس نے پلٹتے ہوئے اپنے آقا اور اُس کے راز کے خلاف ایک مشہور راہزن سے سازش کی۔ راہزن اور غلام میں طے پایا کہ رہزن ان دونوں مسافروں کو جو مختلف سمتوں سے طفلس کی طرف آ

رہے تھے۔ حراست میں لے لے گا یا مار ڈالے گا۔ اور دونوں شناختی انگشتریاں چھین لی جائیں گی۔ جو سوداگر نے ان دونوں کی شناخت کے لئے بھجوائی تھیں۔ اور پھر ڈاکو خود الہ دین بن کر اور اپنی بیوی کو لیلیٰ بنا کر طفلس میں ایک دوسرے کو اجنبی ظاہر کرتے ہوئے جائیں گے۔ اور سوداگر کے سامنے پیش ہوں گے۔ اور کوہ قاف کا پوشیدہ راز معلوم کریں گے۔

پھر ڈاکو اور اس کی بیوی وفادار خانہ پروردہ ملازم کو ساتھ لے کر برفانی پہاڑوں میں گھس پڑیں گے اور اس پوشیدہ خزانے کے مالک بن جائیں گے جو کہ یقین کے مطابق لازماً وہاں موجود ہے۔ کیونکہ غلام بوڑھے آقا کو اس خفیہ تنہا سفر کی واپسی پر ہیرے جواہرات کی بھری ہوئی تھیلی کے ساتھ دیکھتا رہا تھا۔

عرض کر چکا ہوں۔ کہانی طولانی ہے راہ میں راہزن اور اس کی بیوی دونوں پر قابو پا لیتے ہیں۔ تاہم الہ دین کے حواس اور شجاعت لیلیٰ کو بچا لیتے ہیں لیکن ان کے پہنچتے پہنچتے غلام کی شرارت سے ایسے وقت میں محل میں آگ لگتی ہے جبکہ بوڑھا سوداگر انتظار سے تنگ آ کر دونوں کی راہنمائی کے لئے کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہوتا ہے۔ جل مرتا ہے۔ کاغذ کا بہت سا حصہ بھی جل جاتا ہے جس کی غلام کو خبر نہیں ہوتی۔ ان دونوں کو مل جاتی ہے۔

تصور کیجئے کوہ قاف کے دامن میں یہ ملک گرجستان یعنی ہماری بیشتر کہانیوں کا پرستان ہے۔ جس پر ان دنوں روسی بہ تشدد حکمران تھے۔ دوسری طرف عثمانی ترکوں کا طنطنہ تھا۔ قسطنطنیہ کا پر اسرار حرم صوبہ منگریلیا کی شہزادی

لیلےٰ کا بردہ فروشوں کے ہاتھ آنا اور حرم میں لایا جانا۔ پھر الہٰ دین کی بہادری سے دونوں کا نکل آنا۔ بار بار مصائب میں اُلجھنا اور نکلنا۔ سوداگر کا قتل۔ رہزنوں کے مقابل الہٰ دین کی بہادری۔ "وفادار" غلام کی بے ایمانیاں۔ دونوں ہونے والے دُولہا دُلہن کا آسمانی اور زمینی آفتوں سے دوچار ہونا۔ اور آخر کار دونوں کی شادی، پھر جنّت الفردوس کی وادی میں ان کی آبادی کے بعد اس بے اندازہ دولتِ خداداد کا دنیا بھر کی بھلائی کے لئے استعمال۔!

آپ ہی خیال فرمائیے مجھ کو یہ کہانی حقیقت کیوں نہ نظر آتی۔ میرے شاعرانہ طِفلی مزاج کو یہ جنّتِ ارضی کیوں نہ بھاتی۔ کیا ہماری تعلیمی یا تربیتی فضائیں بچپن ہی سے کہانیوں کو محض کہانی سمجھنے اور ان کی بتائی ہوئی کامیابی کے خلاف کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کا انتظام موجود ہے کیا کسی ایسے وجود کو آغاز ہی میں پیش کیا جارہا ہے۔ جس کی راہ پر چلنے کے شوق میں دوسری راہوں سے منہ موڑ لینے کی سمجھ ہی نہیں، ایسا شوق بھی پیدا ہو جو بڑھتا چلا جائے۔

یقیناً ایک وجود موجود ہے جس کی پیروی زندگی کو کامیاب زندگی کے نقطے پر پہنچا سکتی ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس وجود کی فرمودہ راہ پر چلنے کا دستور العمل بھی ایک واضح کتاب میں موجود ہے۔ لیکن میرے دَور کی اسکولی تعلیم کے آغاز ہی سے بچّوں کو اس سے الگ ہی الگ رکھا جاتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ کہانیاں حقیقت کا روپ بھر رہی تھیں اور حقیقت بیگانہ بن رہی تھی۔ اس ناول کو پڑھ کر مَیں طلسم اور کوہ قاف کے خواب دیکھنے ہی میں نہیں بلکہ اس خواب کو تعبیر میں بدل دینے کی دُھن میں رہنے لگا۔

عمر گیارہ برس تھی. مرنے کے بعد ملنے والی جنّت اور حور و قصور کی باتیں تو مولود خواں مولوی صاحبان سے سُن ہی رکھی تھیں زندگی میں اس جنّت کے مماثل ایک مقام کا حصول عین ممکن نظر آیا۔ جالندھر میں بیٹھے ہوئے چونکہ خوفناک پہاڑوں کا تصوّر تک نہ کرسکتا تھا. شہر کی گلیوں کے مقابل پہاڑوں کی دشوار گزار بلندیوں، پستیوں کا خیالی اندازہ کیسے ممکن تھا۔

کس رُخ جاؤں، کوہ قاف کی راہ کس سے پوچھوں؟ یہ دُھن ایسی انوکھی تھی کہ اس کے لئے رازداری کا احساس بھی خود بخود پیدا ہوا تھا. یہ ذہنی اُدھیڑ بُن جاری تھی کہ "فسانۂ آزاد" ہاتھ آگیا. لکھنوی روزمرّہ، لکھنوی محاوروں، فارسی تراکیب میں گندھی ہوئی اُردو عبارتوں کو پوری طرح سمجھنے کے بغیر چاروں جلدیں پڑھ ڈالیں. اتفاق یہ ہُوا کہ اُن دنوں ہی سلطنتِ اسلامیہ ترکیہ سے بلقانی ریاستوں نے (روس کی شہ پر) بغاوت کر رکھی تھی. میں نے سرشار کا تخلیق کردہ کردار آزاد بننے کی ٹھان لی. مجھے اپنا ہی ہم سن ایک خوجی مل گیا۔ میں نے اپنا دیرینہ منصوبہ پورا کرنے کی ہمت کرڈالی۔

اب عمر کا تیرھواں برس تھا کہ گھر سے بہت سا روپیہ ہتھیایا۔ اپنے خوجی کو ساتھ لیا. تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے اور ہم 'بمبئی میل' میں بیٹھ کر بمبئی پہنچ گئے۔ ارادہ یہ تھا کہ جس طرح ریل کا ٹکٹ خرید لیتے ہیں اسی طرح قسطنطنیہ کا ٹکٹ لے کر جہاز میں سوار ہو جاؤں گا. قسطنطنیہ پہنچ کر ترکوں کی فوج ظفر موج میں افسر بنوں گا، دادِ شجاعت دونگا. بلغاریہ، سردیہ، رُومانیہ کے دُھرّے بکھیر دونگا۔ اور روس۔ کہ زار کو اسلامی دنیا کے خلیفہ کے ساتھ شرارت

کرنے کا ایسا مزا چکھاؤں گا کہ وہ تخت چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

جب یہ مُہم سر کر لوں گا تو گرجستان میں گُھس کر طفلس کی سیر فرماتا۔ اپنے خوجی کی باتوں سے دل بہلاتا ہوا کوہ قاف کے پہاڑوں کا کلیجہ چیر ڈالوں گا۔ اور ناول میں مطالعہ فرمودہ یاد داشتوں کی رہنمائی میں اپنے خوابوں کی شہزادی یعنی اس رشکِ جنّت وادی کو تلاش کر لوں گا۔ پھر کیا ہے۔ یہ وادی میرا مرکز بن جائے گی۔ کبھی کبھی لعل و گوہر سے خورجیاں بھرے ہوئے ایک مُشکی پر سوار بَر میں شمشیر جوہر دار سینے پر فاتح روس کے تمغے لٹکائے خشکی کی راہ سے ایران، افغانستان کے لوگوں کو اپنی شان دکھاتا ہوا جالندھر آیا جایا کروں گا۔

اپنے شہر کو نہال کر دینے کے علاوہ جس سرزمین سے گزروں گا، سخی داتا بن کر رفاہِ عام کے ایسے کام انجام دوں گا کہ چار دانگ عالم میرے نام کی مالا جپیں گے۔

آپ ہنس رہے ہیں، ہنس رہے ہیں نا! مجھے بڑی خوشی ہے۔ رو تو نہیں رہے۔ میں آپ کو فسانۂ آزاد کا آزاد نہیں تو خوجی تو واقعی نظر آرہا ہوں۔ ہے نا یہی بات! ہاں ذرا اور ہنسئے۔ مَیں بھی تو ہنس رہا ہوں۔ لیکن میری ہنسی میں آنسو بھی ہیں۔ خدانخواستہ آپ کی ہنسی پر نہیں بلکہ آپ کے کم سن نونہالوں کی ناکام آرزوؤں پر، جو امریکہ اور دوسرے ملکوں سے بارش کی طرح برستے چلے جانے والے تصویری رسالوں، کالموں کو پڑھتے ہیں اور ان ہی کالموں کے ایکٹر بننا چاہتے ہیں۔۔

کامیاب زندگی

ہائے اس چھوٹی سی عمر میں مجھ پر خود اپنی جانب سے بھی اور میرے اردگرد کے لائق فائق لوگوں کی طرف سے بھی ذہانت اور فطانت کی تہمت تھی۔

گھرانے کو تمنائیں تھیں، دنیاوی بلندی کی
کہ اس طفلی میں اک تہمت تھی مجھ پر ہوشمندی کی
سوئے اسکول مسجد سے مجھے تزدیر نے کھینچا
تنازع للبقا کی آہنی زنجیر نے کھینچا
وہ اسکول آہ پہلا زینۂ تعقین بے دینی
دکھاتے ہیں جہاں آئینۂ آئینِ خود بینی
وہاں داخل ہوا میں۔ آہ بختِ سوختہ میرا
سبق مسجد کے بھولے، لٹ گیا اندوختہ میرا
خبر کیا تھی، کروڑوں کا یہی انجام ہوتا ہے
کہ اس تعلیم کی تکمیل ہی ناکام ہوتا ہے

مَیں تو اپنے جس دَور کا تذکرہ کر رہا ہوں محض آغاز تھا۔ آپ دیکھئے تو آج کے لکھے ہوئے نظاروں سے قوم و ملّت کے نوجوان لڑکے لڑکیاں کامیاب زندگی کے لئے کیا کیا اُمنگیں اپنے قلب میں پالتے ہیں، پھر ان میں سے کتنے ڈاکہ زنی، فحاشی، چوری، رہزنی بلکہ غارت گری تک آمادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ عرض کر چکا ہوں، مجھ پر بھی لڑکپن میں آپ کے نونہالوں کی طرح ذہانت و فطانت پائی گئی تھی۔ مَیں ہم عمروں میں بہت ذکی سمجھا جاتا تھا۔ میرا ساتھی خوجی بھی اچھا خاصا ذہین تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی بمبئی کی چہل پہل

اور چکا چوند نے حواس باختہ کر دیئے ہم دونوں راتوں کو تھیٹر دیکھتے۔ دن کو سہ پہر تک اونگھتے، یا بازاروں میں گھومتے۔ سمندر کی چھاتی پر بادبانی کشتی کے ذریعے مونگ دَلتے، چوپاٹی پر ناپتے، بسوں اور ٹرام وے میں بازاروں کو ناپتے۔ چنانچہ سیر تماشے اور رنگا رنگی کی اس بھیڑ بھاڑ میں ترکی اور بلقان کی جنگ میں شامل ہونے کا جذبہ کہیں بچھڑ گیا اور پھر پلٹ کر بیچارہ اس وقت سامنے آیا جب جیب تقریباً خالی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ جالندھر کو واپسی کا ٹکٹ خریدنے کا حوصلہ تک باقی نہ رہا تھا۔

ترکی جانے اور رُوس کو فتح کر کے ارضی جنّت الفردوس کو بسانے کی یاد آئی تو یہ دُھن سمائی کہ اس رُخ پر جانے والے کسی جہاز میں نوکری کر لیں خلاصی بن جائیں۔ ترکی کے قریب جہاز میٹھا پانی لینے کو تو ٹھہرے ہی گا۔ بس آنکھ بچا کر اُتر جائیں گے۔ اور پیدل چلتے قسطنطنیہ میں داخل ہوتے اللہ اکبر نعرہ لگائیں گے۔ فوج میں شامل ہو کر غازی مجاہد بنتے ہوئے گرجستان کے محاذ پر پہنچ جائیں گے۔ ترکوں کو فتح دلا کر ناول میں بیان کردہ پگڈنڈیاں کو روندتے کھنڈوں کو پھلانگتے ایک غار کی دیوار میں خفیہ دروازے سے اس جنّت میں جا گھسیں گے۔

جہاز میں نوکری کرنے کے لئے بارہا ہم گودی میں جا جا کر کھڑے ہوتے رہے۔ بڑے بڑے جہازوں کو حسرت سے تکتے لیکن کچھ کہ نہ سکتے تھے۔

ہائے — کسی نے میرے جذبۂ ملی کی قدر نہ کی۔ جرنیل بنانا تو ترکوں پر موقوف تھا۔ اپنے وطن میں خلاصی گری کے لئے بھی کسی نے سفارش

زکی۔ میرا ہی تو شعر ہے۔ ؎

مرے لئے تو کسی نے نہ کی سفارشِ وصل
نہیں سُنی ہے ہزاروں سے ایک ہاں کے لئے

جواں مردی کی کچھ دن یہی حالت اور رہتی تو آوارہ گردی میں پکڑ لئے جاتے۔ لیکن اب اور کرنا خدا کا یہ ہو گیا کہ ایک صبح سویرے خوجی کی تیز نظر نے میرے ابا میاں کو ہوٹل کے مینجر کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا۔ خوجی تو کھونچ لگتے ہی "ارے وہ آگئے" کہتا ہُوا اُڑنچھو ہو گیا۔ دھر لیا گیا میں اکیلا۔۔۔ جنگی شہسوار اور کوہ قاف کی جنت کا مالک و مختار بن کر زرد جواہر سے خُرجیاں بھرے ہوئے۔ "زندباد الحفیظ پاشا" سنتے ہوئے پلٹنے کی بجائے چپتیا یا جاتا ہُوا، دونوں گالوں کو سہلاتا ہُوا ایک ہارے ہوئے بھگوڑے سپاہی کی طرح رکروٹوں کی اس بارک میں داخل ہو رہا تھا جس کا نام اسکول تھا۔

کامیاب زندگی کے لئے یہ میری اوّلین کوشش تھی۔ افسانے سے متاثر ہو کر جنّت میں پہنچ جانے کے لئے میری یہ روداد افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ اگرچہ میرا جالندھر میرے لئے باقی نہیں لیکن اس دور کے جالندھری دوستوں میں چند ایک ابھی بفضلِ خدا زندہ سلامت موجود ہیں۔ تصدیق کر لیجئے، میرے ساتھی کا نام "لبط" تھا۔ زندہ ہے تو وہ آج بھی اپنی زبان کی قردلی لئے ہوئے پاکستان کے چند ایک شہروں کو اپنے نزولِ اجلال سے مشرف کر رہا ہو گا۔

کامیاب زندگی کے لئے افسانوں کی رہنمائی میں جدوجہد کرنے کے بہت سے واقعات ہیں۔ لیکن یہ آپ بیتیاں سناتا ہُوا ڈرتا ہوں مبادا اِک سنجیدہ موضوع

جس کو آپ واقعی سنجیدہ جان کر مطالعہ فرما رہے ہیں۔ کہیں غیر سنجیدہ بن جائے اور نقہ بزرگ مجھے ٹکسال باہر کر دیں۔ لیکن دیکھئے اگر گھٹیا باتیں نہ ہوں تو بڑھیا کا اندازہ آپ کیسے کر سکیں گے کیا مجھ سے پہلے کسی شاعر نے یہ کہہ نہیں رکھا ؎

حُسنِ زُنّار ہے تسبیحِ سلیمانی کا

اور اب تو آپ مَرے ہوئے شاعروں کا احترام کرنے والے زمانے میں ہیں۔ اور میں تو اِن حروف کو کاغذ پر لاتے وقت زندہ ہوں (کچھ ایسا زندہ بھی نہیں ہوں) لیکن یہ زندگی چند ہی روز کی بات رہ گئی ہے۔ مَیں بھی قابلِ احترام بن جانے والا ہوں۔ یہ کتاب تو دیر تک رہے گی کیونکہ میں ایسے واقعاتِ حیات مکمل کرنے کی آرزو رکھتا ہوں تاکہ میرے ان اعترافات کی روشنی میں اندازہ فرما لیا جائے کہ ہمارے زمانے میں یا ہمارے زمانے تک زندگی پر چلنے والے جیالوں اور من چلوں کے رہنما ماں باپ، بھائی برادر، اساتذہ یا علمار نہیں بلکہ طلسم ہوشربا بنانے والے مصنّف ہیں۔

مَیں تقریباً ساری عمر کچھ اسی رنگ سے اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی ناکام سعی میں لگا رہا ہوں۔ اسی بہادرانہ لڑکپن کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک کتاب "عذرا" پڑھ کر (جو رائڈ ہیگرڈ کے ناول "شی" کا ترجمہ ہے) گھر سے نکل بھاگا تھا۔ تاکہ افریقہ پہنچ جاؤں۔ اس "ناول" بیان کے مطابق وہاں پہاڑ کی کسی اندھی کھوہ میں ایک گردابِ نُور ہے جس میں اگر کوئی نہا لے تو ہمیشہ کی جوانی اور حیاتِ جاودانی پا جاتا ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ مَیں بھی ایک غوطہ لگاؤں اور اس انسانی جسم کے ساتھ حیاتِ جاودانی کی زندہ نشانی بن کر نکل آؤں۔ اس تگ و دَو

میں بہت ٹھوکریں کھائیں لیکن اس آغاز کا بھی وہی انجام ہوا جو ان گدھوں کا ہوا کرتا ہے جن کو افسانوی راہوں پر ہانکنے والے کمہار ہانکتے چلے جا رہے ہیں ان گدھوں کی اور تو کوئی منزل نہیں ہوتی، محض ڈنڈے کھا کر مر جانا ان کی منزل ہے۔

شاذ ہیں۔ وہ نوجوان جو آغاز ہی سے ان کہانیوں کی گمراہی سے باخبر کئے جاتے ہیں۔ کیا ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں تعلیمی اور تہذیبی دنیا اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک نوجوان کو آغازِ حیات ہی میں حقیقت اور افسانے کے درمیان امتیاز کا شعور مل جائے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہمارا ماحول حقیقت نہیں بلکہ افسانے ہی کا بہروپ ہے۔ اس لئے پوری نوعِ انسانی کیا کسی ایک آدمی کی تقدیر کا کامیاب زندگی بسر کرنا معلوم ــ۔

یہ داستان زیرِ قلم کتاب کا اولین باب ہے تکمیل چاہنے والے صدقہ خیرات کے ساتھ دعا کریں کہ اللہ صحت بحال اور مزید عمر کے چند سال احسان فرمائے۔

حفیظ

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی پر ایک معمولی مضمون لکھ کر یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ سخن فہمی اور انسان شناسی کا فریضہ ادا ہو گیا ہے۔ میں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا تو بہت سے صفحے لکھ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو ابھی اس شخصیت کے بارے میں اظہار رائے کی تمہید ہی ہے

افکار مجبور رجعت پسند کے اتنے صفحے میری رائے کے لئے وقف کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ چند الفاظ قبول فرمائیے :

اگرچہ احمد ندیم قاسمی سے میرے ایسے قریبی دوستانہ تعلقات کبھی نہیں رہے جو ان کے اِرد گرد کے سلسلۂ احباب کو حاصل ہیں البتہ اہل قلم کے جو طبقے ان کو اپنے حلقے میں شمار کرتے ہیں میں اُن میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور ان کی قلم کاری کے حسن و قبح سے بھی بے خبر نہیں۔ ایک مدت سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا شعور اور حسن کارانہ تخلیقاتِ نظم و نثر میرے مطالعے میں ہیں۔ مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے احمد ندیم قاسمی کا مماثل کہہ سکوں۔

احمد ندیم قاسمی کی شاعری محض مشاعروں کی واہ وا کے لئے نہیں۔ ان کی انشار پردازی ادیبوں اور نقادوں سے داد طلب نہیں ہے۔ اس دورِ شعروادب میں میرے نزدیک احمد ندیم وہ کام کر رہے ہیں جو مخلوق کی بھلائی کے لئے بگڑے ہوئے کردار کو درست کرنے کے لئے گمرہی کی رفتار کو وہ راستہ دکھانے کیلئے جو قرآن نے بتایا ہے۔ ہر شاعر اور ہر ادیب کا فرض ہونا چاہیئے۔ احمد ندیم قاسمی جس ملک اور جس ملت میں شامل ہیں اس کی بقا بھی چاہتے ہیں، اس کی خرابیوں کی اصلاح بھی۔ وہ اپنے گھر کی خرابیوں کو دور کرنے کے درپے ہیں بلکن اس کو محض اس لئے دوسروں کے حوالے کر دینے کو تیار نہیں کہ اس گھر کی چند خرابیاں ان کو ناپسند ہیں۔ وہ اپنی جان، ایمان اپنے فن اور اپنے شعور کے ذریعے ہم سب کی خیر و بقا کے طالب ہیں۔

"افکار" چاہے تو احمد ندیم قاسمی پر اپنی تحریر کو مکمل کرنے کے بعد، حرف حرف اسی طرح شائع کرنے کے لئے حاضر کر دوں گا۔ اس وقت "افکار" کے صفحے پر یہ سطورِ سلام اور دعا ہی میری رائے شمار فرمائیے۔

ہلالِ عید

آج کل ہلالِ عید اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت نصیب میں ذرا کم ہی ہے۔ کم نصیبی کا سبب حوصلے کی پستی نہیں شوق کی بلندی ہے۔
ہلالِ عید کو اپنی نگاہوں سے دیکھنے کا تھا۔ اُفق دل پر تیر برسانے والی آنکھوں اور محض ابروؤں کی تنی ہوئی کمانوں ہی کا ہدف نہیں بلکہ اُن ارضی چاند ستاروں والے مکھڑے دیکھنے کا تماشائی بھی ہوتا ہے جو کسی زمانے میں کوٹھوں پر سے انگنائیوں میں سے اور روشن جھروکوں سے ہلالِ عید دیکھتے نظر آیا کرتے تھے۔
بقولِ داغ ؎

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

آہ یہ مکھڑے اب کم دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ اس زمانے کا دھندلا سا تصور اپنی پُرانی امنگوں اور بھولی بسری ترنگوں کی یاد کو دل کی اندھی کوٹھڑی میں سے جھلکا دیتا ہے۔ اور بس۔ کبھی کبھی وہ دن بھی عید کی آمد آمد کے ساتھ آ براجتے ہیں۔ جب ابّاؤں، چچاؤں کی روک ٹوک، ڈانٹ ڈپٹ اور امّاؤں

خالاؤں اور دادیوں نانیوں کی چیخ چمکار کے باوجود ہم ہلالِ عید دیکھنے کیلئے
اپنی حویلیوں کی مُمٹیوں پر چڑھ جایا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہماری نگاہیں
اُفق کی گہرائیوں اور شفق کی پہنائیوں سے عید کا چاند کھینچ لائیں گی۔

آجکل تو ہلال دیکھنے کا فریضہ ہم مسلمانوں نے اپنے اپنے فرقے کے
عالموں فاضلوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ اُنتیس یا پورے تیس دنوں کا فیصلہ
اپنی آنکھوں پر اعتماد سے، اب منع ہے۔ اب لڑکیاں بالیاں، بھاوجیں نندیں،
مائیں بہنیں روزے تو رکھتی ہیں لیکن عید کا چاند دیکھنے کی مصیبت میں مُبتلا نہیں
ہوتیں۔ بچے لوگ بھی مُمٹیوں پر نہیں چڑھتے، اس لئے گرتے بھی نہیں اب تو چاند
دیکھنے کی اُمنگیں بھی تشریف لے گئی ہیں۔ لہٰذا میری وہ نظمیں جو عید کا چاند
دیکھنے کی چہل پہل کے بارے میں ہیں کتاب میں موجود تو ہیں لیکن جس طرح
عید موجود ہے، ایمانی ترنگ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر تو مناسب نہیں،
شکرگزار ہوں۔ ان حضرات مولوی مولانا صاحبان کا جن کی آنکھیں سرکاری نگاہ سے
ایک ہلال کی تین چار عیدیں منوا لیتی ہیں۔

میزانِ اقبالؒ کے خلاف

میزان پروفیسر محمد منوّر کے، مقالات کا نثری مجموعہ ہے۔ جس پر مقدمہ محترم سید عبداللہ نے شامل کیا ہے۔ اِن مقالات میں حکیم الامّت حضرت علامہ اقبال کے کلام نظم کا پرانے نئے علمی زاویوں سے نقادانہ موازنہ ہے کلام و مقام اقبال سمجھنا صاحبان قلب و نظر کے لئے آسان ہوگیا ہے۔ اِن مقالات کے عنوانات آپ کو بتادیں گے کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے کن امور پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ اب تک جتنے ان گنت مضامین اور کتب اقبال پر لکھنے والوں نے پیش کئے ہیں ان میں لکھنے والوں کی اپنی ذات کی نمودِ علمی بہت ہی فیلسوفانہ طریق سے ہویدا کی ہے۔ کہ خود اقبال اور اس کا کمال گورکھ دھندا بنا ہوا ہے۔

میزان اقبال میں حسب ذیل سات موضوعات ہیں

۱۔ کلام اقبال پر عربی ادب کے اثرات ۲۔ کلام اقبال میں عجم کا مفہوم
۳۔ توازن۔ اقبال کی شاعری کا ایک اہم پہلو ۴۔ علامہ اقبال کی اردو غزل
۵۔ علامہ اقبال کی نثر نگاری ۶۔ علامہ اقبال جوش ملیح آبادی کی نظر میں
۷۔ ابوالاثر حفیظ بحضور اقبال

چونکہ میں نے زندگی کا آغاز ہی کلام اقبال کے مطالعے اور پھر ساری عمر بطے کانوں اور خاموش زبان سے لے کر ان کے حضور استفادہ کی غرض سے حاضر رہنے میں گذاری اور ان کے انتقال کے بعد بے شمار مضامین اور کتابیں میرے مطالعہ میں آئیں۔ اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو مجھے میزان کے مطالعے سے بلا ناجبا ثر معنی ہو گئے۔ دوسرے حضرات کی تحریں کا میرا پہلا مطالعہ اور مدتوں ان کے حضور بیٹھ کر جو کچھ مجھے حاصل ہوا تھا۔ محمد منوّر نے میری گرد نظر کے اندھیرے گوشوں کو روشن کر دیا۔ میری تمنا ہے کہ اگر یہ کتاب آؤٹ آف پرنٹ نہ ہو

چکی ہو تو اقبال سے سربلندی کا راستہ جاننے کے لئے میزان اقبال جیسے بھی حاصل ہو مطالعہ فرمالیں۔

"نوائے وقت" ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء "نئی کتابوں کے زیر عنوان جناب محمد قیوم ایسے خوش نگار کا تبصرہ "میزان اقبال" پر تعارف کا جو حق تھا۔ بحسن و خوبی ادا کر چکا ہے۔ میری یہ گزارشات میزان اقبال" پر نقد و نقل نہیں۔ میں نے تو ایک بہت ہی اہم فریضہ ادا کرنے کے لئے انتہائی علالت کی حالت میں قلم اٹھایا ہے کیونکہ اس کتاب میں درج دو مقالے جوش ملیح آبادی اور میری ذات سے بواسطہ اقبال تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ علامہ اقبالؒ جوش ملیح آبادی کی نظر میں

۲۔ ابو الاثر بحضور اقبال

اولین مقالے میں جوش کی اقبال دشمنی کا مصنف نے جائزہ لیا ہے اور دوسرے میں علامہ اقبالؒ سے میری نیاز مندی کے متعدد واقعات میرے اعترافات کے طور پر بیان کر دیئے ہیں۔

لیکن دونوں مقالوں میں بعض امور ایسے ہیں جن کی طرف مصنف نے اشارے کر دینے کے بعد وضاحت جوش اور فیض پر نہیں مجھ پر چھوڑ دی ہے ——!

علم و ادب کے اس بہترین نباض اور صدق گفتار انشاپرداز مصنف محمد منورؒ صاحب کو یہ تصانیف کی بروقت ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جوش ملیح آبادی نے "جنگ" کراچی میں اپنی کالم نویسی کے دوران عیارانہ، مفتریانہ اور فتنہ انگیز انداز تحریر سے انتہائی معاندت کے تحت اردو کے شاعروں کو بے اصول، بے وضع بھلے، تنگ ظرف اور غدار قوم کہنے کے لف میں علامہ اقبالؒ کو "سر" اور حفیظ جالندھری کو "خان بہادر" کے خطابات شاعرانہ کمینگی، کانگریسی مقاصد قومی سے انتہائی غداری کے صلے میں دھول کرنے والے شاعر بتایا اور پاکستانیوں کو ہوشیار رہنے کی تلقین اس طرح فرمائی کہ اگر خدانخواستہ پاکستان پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا تو یہی شاعر سب سے پہلے دشمن کے کیمپ میں داخل ہو جائیں گے اور پاکستانی فوجوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیں گے۔

یہ تھا جوش کا وہ حملہ جو پاکستان میں رہ کر پاکستان کے اصل مجوزّ اور مبلغ اقبال کے خلاف پاکستان میں بسنے والوں کو بدظن کرنے کے لئے کیا گیا اور منوّر صاحب نے اس کا ردّ لازم گردانا لیکن اپنی خوش فہمی سے جوش کو غلط فہمی کا مریض جانا اور سمجھانا چاہا -

میں (اس وقت) اپنی ذات کے لئے کچھ کہنا نہیں چاہتا البتہ منوّر صاحب نے جوش کے اس حملے کا علامہ اقبال کے بارے میں جس رنگ سے جواب دیا ہے اس پر بہت کچھ کہنا میرا فرض ایمانی ہے. اس لئے کہ "میزان اقبال" کا مقدمہ لکھنے والے ہمارے دور کے نقاد بلکہ منوّر صاحب کے کالجی استاد سید عبداللہ نے اس مقالے کو بے محل ٹھہرایا ہے. وہ فرماتے ہیں -

- اس مجموعے میں ایک مضمون ایسا بھی ہے جس کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ مضمون نگار بڑی نیک نیتی سے خود ہی اپنے مقصد کو نقصان پہنچا گیا ہے. یہ مضمون ہے "اقبال جوش کی نظر میں ـــــ" میرے خیال میں اس سے جوش کو بلا ارادہ اہمیت مل گئی ہے. جوش صاحب حضرت. علامہ اقبالؒ کے بارے میں جو کچھ فرماتے ہیں فرمایا کریں. ان کے کہنے سے علامہ صاحب. کا کچھ نہیں بگڑتا -

۲ - جوش کا اپنا ایک خاص انداز ہے اور اپنا نقطہء نظر ہے. وہ انہیں مبارک ہو ہم ہر فن کار کو فن کی حد تک مانتے ہیں مگر ہر فن کار کے عقائد ہمارے لئے واجب التسلیم نہیں -

سید عبداللہ مانے ہوئے تنقید نگار ہیں انشا پرداز ہیں. زبان و بیان پر تبصرہ ان کا خاص فن ہے. اس کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت اپنے استادانہ مقام کو برقرار رکھتے ہوئے ان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے پرانے شاگرد کی مقالہ نگاری پر جس طرح چاہیں اور جو کچھ چاہیں فرما دیں. پرانے شاگرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے کالجی استاد کو اتنا ہی بتا دیں کہ اب وہ خود بھی بنفسِ نفیس ادب کے استاد ہیں. لہٰذا منوّر صاحب نہیں کہہ سکتے کہ ع

"رتبہ شاگردیِ من نیست اُستادِ مرا"

لیکن میں سیّد صاحب کا نیازمند ہوں، شاگرد نہیں. نہ پہلے تھا نہ اب وقت ہے کہ ان

سے کچھ سیکھنے کی تمنا کروں۔ مجھے متذکرہ بالا فقروں پر کہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا حق سید صاحب نے اس مقالے پر اپنی رائے کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔

سید صاحب نے فرمایا ہے: "جوش کے کہنے سے حضرت علامہ کا کچھ نہیں بگڑتا":

میں کہتا ہوں کہ جوش سے بھی زیادہ بیہودہ اور بے مایہ شخص اگر کوئی ہو اور اس مقصود پر حملہ کرے جس مقصود کے لئے حضرت علامہ اقبال نے اپنے خونِ جگر سے گلزارِ ملت کو سینچا ہے، تو اس باغ کو اُجڑنے سے بچانے کے لئے ہر غیرت مند مسلمان کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ ایسے فتنہ طراز بدباطن شخص کا منہ توڑ دے!

ہاں میں کہتا ہوں کہ اس رنگ کی ہرزہ سرائی سے اقبال کا سب کچھ بگڑتا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اقبال کا سب کچھ کیا ہے:۔

اقبال کا سب کچھ ہے۔ اسلام، قرآن جس کو وہ ہم سب مسلمان کہلانے والوں کی منتشر اور تفرقہ کے دشت میں سرگرداں زندگیوں کو اس مقام پر لانا چاہتا ہے جو توحید انسانیت کا مقصود ہے۔ اقبال ساری نوعِ انسانی کو وہ پیغام دے رہا ہے جو انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خالق کائنات نے تسخیر کائنات کے لئے وحی فرمایا ہے۔ اقبال بالعموم تمام انسانوں اور بالخصوص ہم (نام کے) مسلمانوں کو ذلت اور رسوائی کی زندگی سے اٹھا کر سربلندی کی راہ دریافت کرنے کے لئے تلقین کرتا ہے کہ ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بُولہبی است

اگر یہ ہے کلامِ اقبال کا مقصود، یعنی اسلام۔ درِ مصطفےٰ ہے۔ ہر انسان کو فرمودہ قرآن کے مطابق اقطار السموات سے بھی بلند ہونے اور ربانی بن جانے کا پیغام۔ تو اگر اس پیغام کے خلاف ایک ایسی تباہ کار تحریک اُٹھے جو درِ مصطفےٰ کی طرف رُخ کرنے والوں کو اس راہ سے ہٹا کر بُولہبی کی ذلتوں کی لذتیں لیتے ہوئے مٹ جانے کی تعلیم دیتی ہے اور یہ تحریک ایسے انداز سے کی جائے۔ کہ لوگ درِ رسولؐ کی طرف جاتے ہوئے ہر قدم پر "پھسلے" کی جانب لے جانے والے دلالوں کی باتوں میں

آنے جائیں اور نہ ہو سجد ہوی یاد ہی نہ رہے تو کیا ایسے بدمعاش دلالوں کے خلاف کچھ نہ کہا جائے؟
کیا ان کا منہ نہ بند کیا جائے؟ کیا لوگوں کو یہ نہ بتایا جائے۔ کہ یہ دلّال تمہارے دشمن ہیں؟ کیا ان سے تحرز
اس لئے نہ کیا جائے کہ ایسے گھٹیا لوگوں کا نام لینے اور ذکر کرنے سے ان کو "اہمیت" مل جاتی ہے —؟

کیوں حضور! قرآن حکیم میں بار بار شیطان الرّجیم کی شیطنت سے بچنے کی آیات کیوں ہیں؟ کیا شیطان کو خاص اہمیت دی جانی خدا کا مقصد ہے؟ اگر دغاباز کی کوئی اہمیت نہ ہو تو خود خداوند کریم ہی انسانوں کو شیطان کے مکر سے بچنے پر بار بار اصرار کیوں فرماتے ہیں؟ کیا یہ تاکید اس لئے نہیں کہ انسان احسن تقویم ہے۔ اور خالق کائنات اس کو احسن المخلوقات ثابت ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ کے معانی آپ جانتے ہی ہیں کیا آپ کو نظر نہیں آرہا کہ جوش ہی نہیں شیطان کے ایسے بہت سے شطونگڑے انسان کو اور خاص طور پر ہر مسلمان کو رفتہ رفتہ اسی مقامِ اسفل تک لے آئے ہیں!

اقبال کے خلاف بہت زنگارنگی کے ساتھ اس وقت سے معاندانہ پراپیگنڈا ہو رہا ہے جب سے اقبال نے یہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" لکھ کر اس ملک میں اسلامی ترانہ عطا کر دیا تھا۔ دشمنی کی یہ تحریک سلگتی رہی بڑھتی رہی۔ لیکن اقبال اپنے عزم پر قائم رہا تا آنکہ الٰہ آباد مسلم لیگ کے صدارتی خطاب میں کفرستانِ ہند میں خدائے واحد کو ماننے والوں کو اصنام پرستوں کے چنگل سے نکال کر احیائے شعائر اسلام کے لئے قومی وطن کی تجویز علانیہ پیش کر دی! میں خود اس تقریب میں حاضر تھا۔

علامہ نے تجویز ہی پیش نہیں کر دی تھی، وہ اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے ملّت کے ذہنوں کو تیار کر چکا ہے۔ اس نے ساری عمر ہماری روحوں میں نافذ کرنے کے لئے سینہ کاوی کے نقوش اپنے کلام میں رکھ دیئے تھے، یہ اسی کا کلام تھا جس نے تسخیر پاکستان کے لئے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بھارت، انگلستان، یورپ، روس، امریکہ اور ان سب کے ملحقات، اشتراکیت، سرمایہ داری، اسرائیلیت، عیسائیت، ہنودیّت اور یہودیت تمام، تمال اقبال کی نقابت کے دشمن ہیں خدا کو ایک اور نوعِ انسانی کو "صُورَۃ" اور معناً ملّت واحدہ بنانے والے نقیب اقبال کو یہ لوگ

کیسے پسند کریں۔ کیوں پسند کریں۔ کیوں نہ اقبال پر ایسے الزام دھریں۔ کہ اس کی ذات اور مقصود ہی سے لوگ بدظن ہو جائیں۔

آہ نہ دیکھئے ان کے منہ پہ تھپڑ۔ کیونکہ وہ اہم بن جائیں گے۔ آج کیا حال ہے؟ مسلمانانِ پاکستان کے نوجوان فرزندوں کا؟ سید صاحب جی ——!

لڑکے لڑکیاں اسکولوں، کالجوں میں کیسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ کیا ہر جگہ کوچہ و بازار میں اسلامی شعار اور رہے سہے وقار و حیاداری کی عملاً اور اعلانیہ تضحیک نہیں کی جارہی۔ کیا یہ سب ان بچوں میں پیدا الشتی تاثرات ہیں؟ کیا ان پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی رنگارنگی اثر انداز نہیں؟

کیا یہ معصوم بچے حق نہیں رکھتے کہ ان کو تباہی سے بچایا اور بتایا جائے کہ بے راہ روی کے اصل محرک کون کیا اور کہاں سے ہیں؟ چونکہ اب تک کوئی منظم کوشش اس تباہ کاری، مخش کاری کو روکنے کے لئے نہیں کی گئی۔ اس لئے تباہی پھیلانے والے کامیاب ہیں۔ پاکستان جس طرح تباہ کیا جارہا ہے۔ اس کے پیچھے محمد رسول اللہ کے مخالفین کے سوا اور کون ہے؟ یہ سازشیں چند انسانوں کے عیش کے لئے کروڑوں کو بدعملی پر مشغول رکھ کر اپنی آقائی قائم کر چکی ہوئی ہیں۔

جوش ہو یا فیض یا ان کے اردگرد کے جیتے۔ آج کل سب کا ڈنکا ہر مردانہ اور زنانہ اسکول کالج میں بج رہا ہے! اخباروں کے دفتر ملوث ہیں ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے ثقافت کے نام پر بے حیائی فحاشی اور ذلت کی لذت میں ہمارے بچوں کو مدہوش رکھنے کے لئے مسلسل منظم بدکرداری کی نہریں جاری ہیں ہر دشمنِ ایمان اور ہر دشمنِ قرآن کا مقصد پورا کیا جارہا ہے؟

یہ کہنا کہ جوش کے کہنے سے حضرت علامہ اقبال کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ایک سطحی اظہار خیال ہے یا حقیقت سے گریز۔ اقبال کا مقصود پورا نہ ہو اس کو روک دیا جائے۔ اس مقصود کے خلاف کامیابی حاصل کر لی جائے تو علامہ کا سب کچھ بگڑتا ہے۔

تصور کیجئے کہ ایک باغ ہے پھول ہیں پھل اور درخت ہیں۔ ان کو زندہ رکھنے کے لئے رنگ، روپ بخشنے کے لئے اس کی خوشبو اور پھلوں کی تر و تازگی کے لئے آفتاب اپنی کرنیں نچھاور کر رہا ہے۔ اس

کا مقصود ہی اس کشتِ کو شگفتہ اور پر بہار رکھنا ہے۔ اگر آفتاب کی کرنوں کو نونہالوں تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ اور رنگ رنگ کے چھپروں سے اس کشت کو ڈھانپ دیا جائے تو یہ پودے گھُٹ گھُٹ کر مرجھا مرجھا کر آخر میں مَر جائیں تو کیا وہ آفتاب جو روشنی پہنچاتا ہے پھولوں میں رنگ بھرتا ہے پھلوں میں رَس پیدا کرتا ہے۔ اپنے مقصد کو پورا کر سکا؟

یقیناً اس کا مقصد ضائع ہو گیا۔ ہاں سورج کی اپنی ذات کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن اس کا مقصود تھا بہار گلزار۔ جو خزاں کی نذر کر دی گئی ——————

ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ اس لئے کہ خوشبو دار، تر و تازہ گلزار ٹھیک چماروں کے لئے پسندیدہ نہ تھا اب سڑاندھ پیدا کی گئی ہے۔ کیونکہ اس باغ کو گلا سڑا کر اپنی غذا بنانے ہی کے یہ گندگی خور متمنی ہیں۔ لہٰذا اب یہ نونہالانِ ملّت اب ان کی خوراک بنتے چلے جا رہے ہیں —!

اگرچہ ابھی بہت سے منوّر صاحب جیسے اہل نظر زندہ ہیں۔ مگر وہ اِکل حلال کے لئے سرگرداں ہیں اہم ترین ضرورت ہے کہ تعفن، سڑاندھ اور فساد پیدا کرنے والوں کے خلاف ہم سب کا اتحادِ خیال اور اتحادِ قلم ہو۔ پاکستانی نونہالوں تک کلام اقبال مسلسل پہنچنا چاہئے۔ موجودہ اثراتِ بدکاری کا قلع قمع کرنے کے لئے منوّر صاحب نے اپنے اس مقالے میں جس طریق سے جوش کی ہفوات کا جواب دیا ہے۔ وہ تو شریف انسانوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ چکلے کے دلالوں پر اس کا کوئی اثر مرتب ہونا ممکن نہیں۔ میں مدت سے یہ کام دن رات کر رہا ہوں۔ لیکن پچھڑ کر پھر اٹھ کھڑے کئے جانے والوں سے نبٹنا مجھ تنہا کے بس میں نہیں۔

موجودہ دَور پر محض چند نظموں اور اس ایک مقالے سے نہیں بلکہ منظم قلمی اور صحیح معنوں میں اسلامی ثقافتی جہاد یا جد و جہد کے بغیر اب اس فتنۂ جاریۂ و محیط کا دور کرنا یا اس کی روک تھام ممکن نہیں —!

میں منوّر صاحب اور اپنے دوسرے ہمخیالوں کو مشورہ دوں گا کہ جلد از جلد اپنے ہمنوا اصحاب فکر و نظر کا ایک ادارہ محض اسی مقصد سے قائم کرنے کا احسان قوم و ملّت پر کریں جو اُجڑے

ذہنوں اور مرجھا جانے والے چمن میں حسن کلام اقبال سے از سر نو بہار لائیں۔ اپنے قلم کو مسلسل حرکت میں رکھیں اور ہر محاذ پر اس فتنے کو شکست دیں۔

"میزان اقبال" کے مقدمہ میں سید صاحب نے یہ تو لکھا ہے۔ کہ جوش کا ایک خاص انداز اور ایک نقطۂ نظر ہے جو انہیں مبارک ہو" ——— کاش یہ بتا دیا ہوتا کہ جوش کے لئے "مبارک نقطۂ نظر" قوم ملک و ملت کے لئے بھی مبارک ہے یا نہیں۔

سید صاحب کو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ سمندری تیندوے کے بہت سے نقطہائے نظر ہوتے ہیں۔ یہ نقاطِ نظر مبارک ہیں یا نحس؟ ان نقاطِ نظر سے تسخیر شکار موثر طریق سے کی جا رہی ہے ———

فیض کی بات بعد میں کرونگا۔ جوش کا ایک نقطۂ نظر بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں سے ملے جیسے ملے روپیہ ملے، شراب ملے، لونڈا ملے، عورت ملے اور بدکاری کے ایسے مواقع حاصل ہوں جن کی بازپرس نہ ہو سکے، ہر شب، شب عیش کی سہولتیں حاصل ہوں۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اپنے ہوس پرستانہ کوڑھ کو اس رنگ سے پیش کیا جائے کہ جیسی کھاج اپنے کوڑھ میں جوش کر رہے ہیں۔ دیکھنے والے اس کھاج کو انقلابی شاعری سمجھیں اور ان کا کوڑھ اپنے جسم پر وارد کر لیں۔ ساتھ ہی اس کوڑھ کے کھجائے چلے جانے کو "انقلاب شاعرانہ" قرار دیں۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان میں رہ کر پاکستان کا کھا کر، پاکستان کی جڑیں کھودنے میں بھارت کی مدد کی جائے کیونکہ پاکستان میں کسی نہ کسی وقت گوشمالی کا خوف لگا رہتا ہے۔

بھارت سے پیسہ بھی ملتا رہے اور دوسری ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں۔ کیا آپ میں سے کسی صاحب نے جوش کی وہ نظم جس کا نام "چتا جور گرم" ہے سنی ہے؟ اگر نہیں سنی تو آپ جوش کی خبث مزاجی اور پاکستان دشمنی کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ دشمنی کیوں ہے؟ جائیے فیض صاحب سے پوچھئے لیکن فیض صاحب کو ناچ نچوانے میں آپ بہت مصروف پائیں گے لہٰذا میں عرض کئے دیتا ہوں جوش کو بھی فیض کے ذریعے روس سے بہت سا روپیہ ملنے کی امیدیں ہیں اور ممکن ہے اب تک مل چکا یا مل جانے والا ہو ——— !

فیض صاحب ثقافت کے نام سے جو کچھ اسکولوں، کالجوں میں کولہے مٹکانے ناچ گانے کی تعلیمات کا ذوق و شوق ریڈیو ٹیلیویژن اور اپنے ناچ گانے کے ادارات کے ذریعہ باضابطہ پیدا کر رہے ہیں۔ یہ تاشقند میں ۱۹۵۸ء کے "ایفرو ایشین رائٹرس کانفرنس" کے بعد روسی روپے کے ذریعے طے ہو چکا تھا۔ میں انشاءاللہ کسی آئندہ اشاعت میں وہ تمام اسکیم بیان کر دوں گا۔ جو فیض کے اور میرے سامنے روس کی طرف سے پیش کی گئی تھی جس پر میں نے تھوک دیا تھا۔ مگر فیض اس سکیم کو روپے کے ساتھ پاکستان میں لے آئے اور اب بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ میں نے اس سکیم کے متعلق سربراہانِ ملک و ملت کو باضابطہ آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن یہ ذکر دوسری نشست میں ہوگا۔

آج یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اقبال کی مخالفت کے بغیر یہ سکیم پوری طرح چل نہیں سکتی تھی۔ بھارت بھی اس سکیم کو جوش کے ذریعے اپنے روپے کی امداد سے اب مغربی پاکستان میں مستعدی سے چلوا رہا ہے —— جوش تو بھارت کا چنا ہوا جھنڈے تلے کا "وہ" ہے۔ جو لکھنؤ کے چوک سے چھانٹا گیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ "فسانۂ آزاد" میں جھنڈے تلے والے کیا کہلاتے ہیں اور کیا کچھ کر دکھاتے ہیں؟

نوائے وقت ۲۰ فروری ۷۳ء

عابد علی عابدؔ

سید عابد علی عابدؔ سے میری راہ و رسم کی ابتدا ۱۱ جون ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی۔ میری زندگی کا یہ وہ دَور تھا جب میں بجرمِ شاعری گھر ہی سے نہیں جالندھر سے بھی نکال دیا گیا تھا۔ سکول سے تو ۱۲ء ہی سے بھاگ گیا تھا۔ اب جب دیس نکالا بھی مِلا تو اپنی بیوی اور ایک بچّی کے ساتھ سُسرال میں پناہ گزیں ہُوا۔ میری بیوی کے بھائی یعنی میرے برادرِ نسبتی نے اُنہی دنوں منشی فاضل کا امتحان دیا تھا۔ چونکہ میں ساتویں جماعت سے بھاگا ہُوا شاعر تھا اس لئے میرے منشی فاضل برادرِ نسبتی نے ایک شاعر منشی فاضل سے ملاقات کرانا میری حیثیتِ فکری اور علمی کو اپنے مقابل حقیر ظاہر کرنے کے لئے لازم جانا۔ وہ مجھے پُرانی انار کلی کے ایک محلہ ہوہبی منڈی میں لے گئے۔ جہاں ایک نہایت ہی خوش رُو نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ یہ تھے سید عابد علی عابدؔ ——— جو میرے برادرِ نسبتی کے ہم سبق منشی فاضل تھے۔ بہت شگفتہ رُخسار اور بہت ہی خوش گفتار۔ سخن فہم اور سخن سنج!

اس شناسائی کے بعد اُن کی رحلت تک ہم دونوں میں ایک دوسرے کی قدر دانی اور قدر افزائی موجود رہی۔ اگرچہ وہ اس لاہور میں محاسبۂ سخن کے دَوران حضرت مولانا تاجورؔ نجیب آبادی کی جرار صفوں میں تھے۔ مولانا یا اُن کے دوسرے رفیقانِ پیکار عموماً اُن محفلوں اور مشاعروں میں جہاں مَیں موجود ہوتا تشریف نہیں لاتے تھے۔ لیکن سید عابد علی عابدؔ اور آثر صہبائی چونکہ مولانا تاجورؔ کے رفیق ہونے کے باوجود اُن کے شاگرد نہیں تھے۔ خود شاعر تھے اس لئے تقریباً ہر ستائیے میں ایک دوسرے کو سناتے اور سنتے۔

آج عابدؔ پر انار رشتہ توڑ کر مجھے پیچھے چھوڑ کر براہِ راست خدا سے لَو لگائے ہوئے چلے گئے ہیں۔ مَیں ہوں کہ میری "یاری" اُن کی خدا دوستی کے باوجود ختم ہو نہیں سکتی۔ مَیں ان کے علم و فضل نحو کا اور سخن فہمی ہی کا نہیں اُن کی ایسی قدر دانیوں کا بھی شکر و سپاس لئے چل رہا ہوں۔ جس کا اظہار وہ

میرے مُنہ پر کم اپنے اُن شاگردوں کے سامنے زیادہ کرتے تھے جن کو اُردو ایم اے کا امتحان دینے کے لئے برائے استفادہ ان کی خدمت میں حاضر ہونا تعلیمی فریضہ تھا۔ یہ طلبا اکثر اُن سے میرے کلام کی توصیف سُن کر مجھ سے اپنے مقالوں کے لئے میری حیاتِ سخنوری کے کوائف پوچھنے آتے۔ یہ تھی سیّد صاحب کی فراخدلی —— !

زندگی گزارنے کی مختلف راہوں کے باوجود سیّد صاحب میرے شعر میں خوبی دیکھتے تو اس کو اپنے حلقے میں بیان کرنے سے دریغ نہ فرماتے۔ میں نے شاعروں میں یہ بات ذرا کم ہی دیکھی ہے۔

لاہور میں میری شاعری کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ اُردو شعر کی تاریخ میں ایسا اہم ہے جس کو میں اس لئے یہاں بیان کر رہا ہوں کہ اس کا تعلق سیّد عابد علی عابدؔ کی ایک حرکت سے ہے!

میں ۱۹۳۸ء میں "شباب اُردو" کا جوائنٹ ایڈیٹر تھا۔ عابد صاحب اپنی نوین تالیف جو ایک ڈرامہ تھا لائے تاکہ میں اس پر اپنے قلم سے تبصرہ کر دوں۔ اور "شباب اُردو" کے صفحات پر چھاپوں۔ میں یہ ڈرامہ گھر لے آیا۔ آغازِ زندگی میں تھیٹر کا رسیا رہ چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو "جگ مگیانہ" میں رام لیلا کے سٹیج پر کھیلنے کی راتوں کے لئے "میر بل" ڈرامے لکھ چکا تھا جو طبع زاد تھے اور کاشی رام دہلوی کی تھیٹریکل کمپنی نے اُن کو سٹیج کیا تھا۔ اس لئے میں نے عابد صاحب کی اس کتاب کا بہ شوق مطالعہ کیا۔ عابد صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ ڈرامہ انگریزی سے ماخوذ ہے۔ مشرقی انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ چونکہ میں ڈرامے کو ادبِ لطیف کی اہم ترین صنف مانتا ہوں جس پر تبصرہ آسان نہیں۔ میں نے اس کو غور سے پڑھا۔ خیال آیا کہ یہ تو اخذ کردہ ہے میں طبع زاد لکھوں۔ تو شاید اس سے بہتر لکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ افرنگی معاشرت ہماری زندگی سے مختلف ہے۔ اپنی ثقافت کو ہم بہتر طریق سے پیش کر سکتے ہیں۔ "ADAPTATION" سے وہ حقیقی بات پیدا نہیں ہوتی جو اپنی معاشرت کو پیش کرنے کے لئے ضروری ہے۔

سیّد عابد صاحب کے مؤلفہ ڈرامہ پر سرسری تبصرہ لکھنے کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔ سوچتا رہا

کہ میں "کیوں نہ ایک ڈرامہ لکھوں" —— دل نے آواز دی۔ حفیظ بی فکرِ معیشت سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب میں —— "فرصت ہی نہیں ملتی —— فرصت ہی نہیں ملتی" —— گنگنانے لگا۔ چند ساعت میں ایک نظم ہو گئی۔ یہ نظم "فرصت کی تلاش" میں نے چند سطورِ نثر کے ساتھ عابد صاحب کو اُن کے ڈرامے کی عدم طلبی کا عذر بیان کرتے ہوئے ارسال کر دی۔ عابد صاحب نے اس کو نہ صرف پسند کیا، بلکہ مجھ سے پوچھے بغیر روزنامہ "زمیندار" میں شائع کروانے کی "حرکت" فرما دی۔

یہ نظم "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ تو اس پر "بے تُکی نظم" اور "بے تُکا شاعر" کا شور مچ گیا۔ یہ شور سب سے پہلے لکھنؤ پھر دہلی پھر جہاں جہاں بھی اہلِ زبان کو مجھ سے اہلِ زبان کا شاگرد نہ ہونے کی وجہ سے خفگی تھی۔ اس نظم کی پیروڈیاں چھپنے لگیں۔ میں نے عابد صاحب سے کہا۔ "حضرت سید بادشاہ —— آپ نے یہ نظم "زمیندار" میں شائع کرا کے مجھ پر بھڑوں کا ایک چھتہ حملہ آور کر دیا ہے۔" وہ ہنسے اور کہا۔ "دیکھ لیجئے گا۔ آج جسے یہ لوگ بے تُکی نظم کہہ رہے ہیں کل اس کی نقل کرتے پھریں گے"

اس وقت تو میں نے ان کی بات خوش فہمی قرار دی۔ لیکن چند ہی ماہ کے بعد یہی نظم ہر نئے ہی نہیں چند پرانے شاعروں کے لئے بھی کچھ "اور چاہئے۔ وسعت مرے بیان کے لئے" کا بہانہ بن گئی۔

میں ایک دن حضرت علامہ اقبال رح کی خدمت میں حاضر تھا۔ "اودھ پنچ" دکھا کر حکیم الامت نے کہا کہ حفیظ صاحب آج کل آپ کی بے تُکی نظم کی پیروڈیاں مزا دے رہی ہیں۔ کیا تم بھی ان کو پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں اور اصل واقعہ بیان کیا۔ بتایا کہ میرے اس بے تُکے پن کی شہرت سید عابد علی صاحب کے سبب سے ہوئی ہے۔ علامہ مرحوم ہنستے رہے اور فرمایا کہ سادات کی وجہ سے بہت لوگ فسادات میں بلا وجہ مبتلا رہتے ہیں۔ بہر حال تم یہ جان لو کہ ہر وہ جینئس (طباع) جو کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے۔ بے تُکا کہلاتا ہے۔ تمہیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ جواب دینے کی بجائے اپنی اختراعات کو جاری رکھنے میں لگے رہئے۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ یہ نظم میرے گیتوں اور دوسری تمام اُن نظمیات کا آغاز

تھی۔ جس کے سبب میں موجودہ دور کی نئی اختراعاتِ سخن کا پیش رو قرار دیا گیا۔ اور یہ سید عابد علی عابدؔ کی حرکت سے وابستہ ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر وہ اس نظم کو "زمیندار" میں نہ بھیجتے تو شائد میں اسے شائع ہی نہ کرتا۔

دیال سنگھ کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں مجھے سید عابد علی عابدؔ نے خاص طور پر متعدد مرتبہ طلبہ اور اساتذہ کے ہجوم میں پیش کیا۔ میری غزل گیت اور نظموں کو تین تین اور چار چار گھنٹے تک سُنواتے اور پھر بحیثیت صدرِ مجلس ان اشعار کے بارے میں اپنے شاگردوں اور سٹاف کے سامنے میرے فن کی تصریح فرماتے۔ میں ہمیشہ ان کی وسیع النظری اور سچّی قدردانیٔ سخن کا شکر گزار اس محفل سے نکلا۔

متعدد مشاعروں میں میری ان کی ملاقات ہوتی۔ مشاعرہ ہی نہیں۔ مشاعرہ سے پہلے یا بعد بھی ہم ایک دوسرے کے شعر و سخن سُنتے۔ آج یہ باکمال جو ڈاکٹر تاثیرؔ کے بعد میری طرزِ سخن کا سب سے بڑا مدّاح تھا۔ مجھ سے پہلے اُس دُنیا میں چلا گیا ہے جہاں وہ قدماء کی محفل میں رطبُ اللسان ہوگا۔ اور میں یہاں آنسوؤں کے ساتھ یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اکہتر برس کی منزلیں طے ہو چکی ہیں اپنا ہی شعر بار بار دہراتا ہوں ؎

پیاروں کی موت نے مری دُنیا اُجاڑ دی
یاروں نے جا کے دُور بسائی ہیں بستیاں

قدردان بزرگوں میں میرے محسن شیخ سر عبدالقادر آج نہیں ہیں۔ سر راس مسعود، حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، حبیب الرحمٰن شیروانی اور خواجہ حسن نظامی نہیں ہیں۔ ہم عصروں میں تاثیرؔ نہیں ہے۔ عبدالمجید سالکؔ نہیں ہیں۔ امتیاز علی تاجؔ نہیں ہے۔ امید تھی کہ سید عابد علی عابدؔ میرا مرثیہ کہیں گے لیکن وہ بھی منہ پھیر کر چل دیئے۔ اب میں خود اپنا مرثیہ ہوں۔ خیر ؎

جینا پڑے گا اے جانِ کشیریں
کرنی پڑے گی تلخی گوارا !!

میرے ہمعصروں میں عابد علی عابدؔ رفتہ رفتہ واقعی جنید سخن سنج اور سخن فہم ہوگئے تھے شعروادب کے دریاؤں میں غواصی اور تیراکی ہی میں اُن کی زندگی گزری۔ وسیع القلب تھے اور ہر صاحبِ فن کی خوبیوں پر صدقِ دل سے قدردانی کے الفاظ کہنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اب جسمانی طور پر وہ موجود نہیں ہیں۔ البتہ رُوحانی اور ذہنی طور پر وہ میرے ساتھ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ ہی اس دُنیا سے جائیں گے۔

عجیب بات ہے کہ مولانا محمد حسین آزادؔ کی برسی کے پروگرام میں اُن کا نام دیکھ کر علالت کے باوجود میں نے اس تقریب کی شرکت منظور کر لی تھی۔ برسی کے پروگرام میں سیّد عابد کا نام۔ بزم میں ملاقات کا یقین تھا۔ سُنا تھا کہ وہ اپنی مسلسل بیماری کے باوجود اس تقریب میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ لیکن آہ سید عابد علی عابدؔ۔ کہ اُن کا مقالہ سُننے کی بجائے مجھے اس تقریب کی صدارت تفویض ہوئی اور میری ہی طرف سے اُن کی رحلت پر قراردادِ ماتم دُنیا کے سامنے آئی۔!

نیز ایک بہت ہی پرانے دوست ہم عصر اور ہم نوا شاعر ایک ادیب ایک صاحبِ فن سے جُدائی پر مجھے اپنی گریہ وزاری کا اظہار ریڈیو سٹیشن سے بھی کرنا پڑا۔ آج مدیر "تخلیق" کے ارشاد کی تعمیل بھی میرا فریضہ ہے ؎

میں سمجھتا تھا کہ پیمانہ ہے لبریز مرا!
دوستوں سے ہے قدم سوئے عدم تیز مرا

آج معلوم ہوا سست ہے رفتار مری
بار ہے مجھ پہ وجودِ الم انگیز مرا

کیا غزل کی اہمیت ختم ہوگئی ہے ؟

یہ سوال ایک حکومتی ادبی رسالے کی منتسب کمیٹی نے اُردو کے چند شاعروں سے ۱۹۵۱ء میں کیا تھا میرے ساتھیوں سے درگذریے ہاں۔ یہ جواب ہے جو میں نے دیا تھا اس پر آپ بھی ہنس لیجیۓ۔ مگر بعض کے لیۓ یہ مزاحیہ تلخ ہوگا۔

یہ استفسار بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ ایسے وقت کیا گیا ہے۔ جب اُردو کی دنیا پر باہر سے لایا ہوا رنگ جمانے والے خود اپنا رنگ اُڑا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ پُرانے ادب و شعر کو بیک جنبشِ قلم مٹا دینے کے یہ دعویدار، یہ خود ساختہ "لارنتیۓ جرنیل" یا تو اپنی تصوری فتوحات کے نشے میں (غین ہو کر) آرام فرما چکے ہیں۔ یا اپنی شکست خوردگی کی حالت میں غرقِ ندامت ہیں۔

چونکہ استفسار براہِ راست مجھ سے کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ ایک تفتیش ہے۔ ہمارے اخبارات اس لفظِ تفتیش کو انگریزی کی اصطلاح "انکوائری" سے عام فہم بنا چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسی انکوائری ہے۔ جو کسی بہت بڑے فساد، خون خرابے، شور شرابے، توڑ پھوڑ، قتل و غارت کے بعد کسی سرکاری کمیشن کے ذریعے ہوا کرتی ہے۔ اور واقعی ہونی بھی چاہیۓ ــــ!

آپ کے حضور ــ! مَیں اس تفتیش یا "انکوائری" کے ضمن حاضر لایا گیا ہوں۔ شاید اس لیۓ کہ آپ مجھے غزل کا شاعر نہیں سمجھتے۔ شاید آپ محتسب بزرگانِ آئینِ اَدب نے یہ سُن رکھا ہے کہ حفیظ جالندھری تو رنگا رنگ۔ کی عشقی، فطری، جنگی، خوش آہنگی، یا بے ڈھنگی نظموں، گیتوں، نغموں، ترانوں وغیرہ کا شاعر ہے۔ ہو نہ ہو غزل کو مردود قرار دے کر مار دینے اور دفن کر دینے والوں کے ساتھ یہ بھی شامل ہے۔ غزل کے سلسلے میں جس فساد کی انکوائری ہو رہی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی ان فسادیوں میں شریک پایا جائے۔

اس سے ظاہر ہے کہ میں استفسار کا جواب نہ بھی چاہوں تو عرض کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ

دھر لیا جانا آج کل کوئی بڑی بات نہیں۔ اب گذارش میری یہ ہے۔ اے محاسب صاحبان!۔
کہ ! مَیں تو غزل ہی کا شاعر ہوں۔ مجھے غزل کے سوا اَور کچھ آتا ہی نہیں۔ شعر کی رُوح جسے تغزّل کہتے ہیں۔ میرے مذاقِ سخن کے پیکر میں بسی ہوئی ہے۔ مَیں نے اس تغزّل کو زنگار رنگ کی صورتیں دینے۔ پوشاکیں پہنانے کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں۔ لہٰذا یہ مناسب نظر نہیں آتا کہ مَیں غزل کی اہمیّت پر ایک گراں بار مقالہ کے تلے تفتیش کمیٹی کی پٹی ڈھیلی کرنے کا ملزم بھی بن جاؤں؛ البتہ عینی شاہد ہوں۔ فساد کے اصلی واقعہ کا جو میرے روبرو گذرا تھا۔ اس لئے تحریری بیان پیش کر دیتا ہوں۔ تاکہ تحقیقات میں مدد دے اور سند رہے

فِدوی کا بیان حسبِ ذیل ہے۔

"ہم لوگ" ــــ مَیں اور میرے چند ہم عَصر ساتھی۔ یعنی مملکتِ اُردو کے چند شہری یا اولاتِ ادب و شعر کے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ ہم نئے آنے والوں کے لئے پُرانے انجنیر، مستری، محنتی مزدور۔ اُردُو شعر و فن کی نئی نئی تعمیریں اُٹھانے سجانے اور پرانی تعمیراتِ عالیہ کو دستِ حوادث سے بچانے میں لگے ہوئے تھے۔ کہ اچانک دُور بازار کی طرف سے جوش و خروش کی آوازیں کانوں پر ضرب لگانے لگیں۔ یہ آوازیں شوریلی تھیں۔ بھیانک اور ڈراؤنی ــــــ!

ہمارے دَورِ حیات میں ہڑتالیں اور سیاسی جلوس کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہائے۔ ہائے، ٹوڈی بچہ۔ زندہ باد، مُردہ باد وغیرہ نعرے اب کثرتِ استعمال کے سبب بے معنی ہو چکے تھے اس لئے اس بازاری شور و شغب پر ہم نے کان نہ دھرے۔ اپنی لگن میں لگے رہے۔ ہم حصولِ پاکستان کے بعد اُصُولِ پاکستان کی بقا کے ذہنی حُسن کارانہ معمولات کے کارندے میں فرصت کہاں تھی کہ اس افراتفری کے تماشائی بنتے ــــ!

لیکن یہ شور و شر بڑھتا اور ہمیں اپنے ہی سر چڑھتا نظر آیا۔ توڑ پھوڑ۔ گُتھم گتھا فضیحتی۔ مار دھاڑ اب ہمارے قریب آ گئی۔ دیکھا تو سامنے کچھ عجیب و غریب قسم کے لوگ سروں کے بال اُلجھائے ہوئے اَدبی راہ گیروں کو ٹھینگے دکھاتے اور دھاندھ مچاتے ہماری طرف آ رہے تھے۔

سیدھے ہماری طرف ———— ! ان کے حلق نعروں سے پھٹے جا رہے تھے ——— غزل کو ختم کر دو۔ غزل کو مار ڈالو۔ غزل کو دفن کر دو ———"

یا اللہ! یہ کیا تماشا ہے۔ یہ تو نئی طرز کا فساد ہے۔ غزل بیچاری کی کم بختی کیوں آگئی ہے؟

ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ہماری حیرت کا یہ آئینہ سامنے آگیا۔ دیکھا کہ پانچ پانچ۔ دس دس کے جتھے۔ ٹولیاں، مزاج کی تند خوئی اور سروں کی ژولیدہ موئی کے ساتھ ہتھوڑے اور درانتیوں بلکہ کلہاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے پرچم ہلاتے ہوئے ہمارے اِرد گرد آ کھڑے ہوئے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ان کے ساتھ کچھ ناشخص لوگوں کے ہاتھوں میں اینٹ پتھر ہیں۔ بعض کدال لئے ہوئے ہیں۔ بعض گارے کی بھری ہوئی ٹوکریاں اٹھائے۔ پھاوڑے سنبھالے ہوئے زور زور سے چیختے چنگھاڑتے دیوانہ وار لپک جھپٹ رہے ہیں اور سب کے سب ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے اُن کارناموں پر اینٹ، پتھر اور مٹی پھینک رہے ہیں۔ جہاں غزل کو دیکھ پاتے ہیں اس پر نالی سے اُٹھا کر گارا دے مارتے ہیں ہر اُس نقش پہ جس کی جھلک نظر آتی ہے۔

جب یہ ہمارے اِرد گرد جمع ہو گئے تو ہمیں ٹکّے دکھانے لگے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

یہ مسکرانا ہمارے لئے ڈانٹ ڈپٹ کا اور بھی زیادہ سبب بن گیا۔

مسکرانے کی بات یہ تھی۔ کہ ہم ان کو پہچان گئے تھے۔ ان میں سے چند کچھ عرصہ پیشتر ادب و شعر کے کاریگر بننے کی خاطر میرے اور میرے چند ہمعصر شعراء کے پاس شاگردی کے ارادے سے آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ان میں شعر و شاعری کے نازک کام کی اہلیت کچھ کم تھی۔ نیز یہ کاریگری کے لئے محنت اور مشق پر بھی آمادہ نہ تھے۔ لہٰذا نہ میں اُن کو کچھ سکھا سکا تھا نہ میرے ہم عصر ——!

ہمیں معلوم تھا کہ ان لوگوں نے ایک "انجمن تحسینِ باہمی" بنا رکھی ہے۔ اس طرز کی انجمن بنانے کی تحریک یہ خود کہتے تھے کہ روس سے آئی ہے۔ اس انجمن نے ایک مدّت سے جتھے بازی کا پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔ لیکن آج سے قبل یہ لوگ ہمارے قریب پھٹکتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مگر

آج یہ تھے۔ اور اِن کے کَسے ہوئے مُکے۔

ہمیں مُسکراتے دیکھ کر اِن کو تاؤ آگیا۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ اُس نے خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ہم جانتے ہیں جو کام تم کر رہے ہو۔ تم غزلیں" بنا رہے ہو"۔ "بنا رہے ہو"۔ سُن کر ہم پھر مُسکرائے۔ اس پر یہ اور بھی جھلّائے۔ جو کام ہم کر رہے تھے۔ اُس پر خاک اُڑائی۔ اینٹ پتھر پھینکے۔ پھولوں کو پیروں تلے کچل ڈالا۔ دیوار و در کی نقش آرائی پر کیچڑ اچھالنے لگے ——

بے شک ہمیں غُصّہ تو آیا۔ لیکن ہم خاموشی سے اُن کے نرالے مونہوں اور تھوتھنے سمجھ رہے تھے۔ اب ان میں سے۔ ایک نے دوسروں کو چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود گلا پھاڑ کر ہم کو دھمکانا شروع کیا:۔

ہنسو نہیں تمہاری ہنسی ہمیں" پرووکیٹ" PROVOCATE کرتی ہے۔
دو چار اور آوازیں آئیں" پروفیسر صاحب کی سنو۔ نقّاد صاحب کی سنو"۔

ہم ان سب کو پہچانتے تھے۔ یہ کسی کالج میں ریڈر یا لیکچرار تھے۔ پروفیسر کہلواتے تھے۔ ہمیں فسٹ ایئر فُول سمجھ کر گُرگُر کنے کے لہجے میں سبق دینے لگے۔ یہ سبق یا لیکچر مربوط کم تھا مضبوط زیادہ مضبوط یعنی تحکمانہ۔ "ڈانٹیلا" "کٹیلا ——!

"او —— تم لوگ مَیں تم سے کہتا ہوں۔ جی ہاں۔ تُم۔ جو شاعر کہلاتے ہو۔ یہاں بیٹھے یہ کیا کر رہے ہو۔ پرانی بنیادوں پر نئے مکان بنا رہے ہو نا۔ ہر صحن پر پھلواریاں لگا رہے ہو نا۔ فوّاروں کی دھاریں لہراتے ہو۔ پرانے رنگ گھولتے ہو۔ نئی تصویریں سجاتے ہو —— ! سُنت، نکمّے بیکارے۔ ناکارے۔ گئے گزرے۔ پرانے بھولے بسرے —— !"

"کیا ہیں۔ یہ تمہارے ایوان یہ دیوان۔ یہ شعر و اَدب کی حویلیاں۔ یہ محل ماڑیاں۔ باغ بغیچے۔ زیبائش اور یہ آرائشیں۔ کیا ہیں یہ سنسکرت۔ پراکرت۔ عربی۔ فارسی۔ بھانشا سے لئے ہوئے انگ۔ تم ان سے پھول پتّی کی نئی سے نئی صورتیں بناتے چلے جاتے ہو —— !

اب ایک اور زوردار آواز آئی - یہ سب گلکاریوں کے الگ رنگ آپس میں میل ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ حالانکہ میل ملاپ کی کوئی ضرورت اب نہیں رہی ——— یہ انفرادی زمانہ ہے۔ پروفیسر صاحب مجھے ذرا ان کی خبر لینے دیجئے میں لگی لپٹی رکھنے والا نہیں۔ صاف بات کہوں گا —" دیکھو جی یہ دقیانوسی زبانوں کی تانیں ہیں۔ جو تم اُڑا رہے ہو۔ سب بیکار ہیں۔ بیہودہ ہیں"۔ ری ایکشنری "REACTIONERY"

پروفیسر صاحب کو ہٹا کر یہ لمبے تڑنگے۔ پتلے دُبلے صاحب "کامریڈ پیچھے ہٹو" کہتے ہوئے ہم کو اپنی خوش گفتاری دکھاتے رہے۔

"میں تمہیں جانتا ہوں جی" تمہاری زبانوں کا میل ملاپ ہی نہیں۔ تمہارا آپس میں بھی میل ملاپ ہے۔ ایک دوسرے کی واہ واہ کرتے ہو۔

"کیا لفظ ہے وُہ۔ پروفیسر کامریڈ جی۔ وہ کیا لفظ ہے؛ جو اِن لوگوں نے دل بڑھانے کے لئے بنا رکھا ہے"؟

"ہاں داد۔ داد" ہونہہ" ۔ یہ داد حوصلہ بڑھا کر پھولُ اُگانے کے لئے کھاد ہے۔ دیکھو جی میں تم کو سمجھانے کے لئے تمہاری طرف تمہاری ہی طرح قافیے پر قافیہ لڑھکا رہا ہوں۔ بتا رہا ہوں کہ یہ بکواس جس کو تم غزل کہتے ہو۔ قافیہ بازی کے انفرادی اشعار ہیں۔ ان کے اندر پُرانی نکمی" موسیقی کے اقدار ہیں۔

"اَقدار تمہاری زبان ہی کا لفظ سہی۔ ہم ضرورت کے وقت سب کچھ استعمال کرنے کا پیدائشی حق رکھتے ہیں۔ اور بغیر پوچھے جہاں ہمارا جی چاہے۔ استعمال کر لیتے ہیں۔ تم ہوتے کون ہو ہم کو ٹوکنے والے ———"

"ہاں میں کہہ رہا تھا۔ کہ تمہاری غزل میں سے ہمیں رنگ۔ رنگ کی اَخلاقی خوشبوئیں آتی ہیں۔ یہ خوشبوئیں تمہاری شاعری کی پُشت پناہ ہیں۔ امیروں کے چونچلے ہیں۔ بتاؤ ہیں کہ نہیں؟ کہو —— ہاں —— ورنہ ———!

"بولو تم پیسے والوں کے شاعر ہو کہ نہیں؟ بولتے کیوں نہیں۔ چُپ کیوں ہو۔ مسکراتے ہو۔
ہمیں "اری ٹیٹ" کرتے ہو — ! یاد رکھو تم غزلیں بناتے ہو۔ یہی غزلیں ہماری ترقی پسندی
کی راہوں میں پہاڑ ہیں۔ ہم ان پہاڑوں میں سرنگیں بنائیں گے۔ ہم غزل کو بھک سے اُڑا دیں گے
— ! کامریڈ پروفیسر جی اب میرا سانس پھول گیا ہے۔ ذرا لانا واڈ کا" — !
یہ صاحب چُپ ہوئے تو پھر وہ پہلے پروفیسر صاحب آگے آگئے :۔ "دیکھو ہم تمہیں بتائے دیتے
ہیں۔ کہ انسان کی سماجی ترقی۔ مارکس۔ فرائڈ۔ اینگل بلکہ کروپاٹکن کی تقلید سے حاصل ہوتی ہے
تمہاری اُجڑی ہوئی مذہبی اخلاقی روایتوں میں کچھ بھی نہیں۔ پرانے زمانے کی شاعری غزل ہے جس
کو تم سب سے بہتر سمجھتے ہو۔ یہ غلامی کے دور کی یادگار ہے۔ رجعت پسندی کا مظاہرہ ہے۔ ہاں
رجعت تمہاری عربی بولی کا لفظ ہے۔ ہم نے اس کا انگریزی ترجمہ ڈھونڈ رکھا ہے۔ اس کو ری ایکشن
کہتے ہیں۔ ترجمہ کچھ بھی ہو۔ تم "ری ایکشنری" ہو اور ہم PROGRESSIVE پروگریسو ہیں۔
تمہاری شاعری غزل ہے اور کچھ بھی نہیں۔ غزل۔ غزل اُدں۔ ہوں۔ اُدں ہوں — !
اب ان پروفیسر صاحب نے کاغذ کا پرزہ نکال کر دیکھا — !
کیا ہے۔ یہ لفظ تغزّل۔ کیا معنی ہیں اس کے؟ جس کو تم شاعری کی رُوح کہتے ہو۔ میں
تم کو بتاتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو۔ میں کون ہوں؟ مَیں ہوں نقاد۔ ہاں میں کالج کا پروفیسر ہوں
تم کو بتانا میرا فرض ہے۔ یہ تغزّل کوئی لفظ نہیں۔ اصلی لفظ ہے "تگ جُل"۔ "تگ کہتے ہیں
"چلنے" کو اور "جُل" کے معنی ہیں جُل دینا۔ دغابازی کرنا۔ یہ غزلیں لکھ کر تم دغابازی
کرتے ہو۔ تمہاری شاعری کیا ہے۔ دھوکا۔ طلسمی فانوس "تگ جُل" — تم نے اسے
تغزّل بنا لیا۔ اپنی مذہبی بولی میں مِلا لیا — یہ ہے "ری ایکشن"۔ "ری ٹریٹ"۔
تمہاری غزل انسان کو غلام بنانے میں دنیا بھر کی شاعری کی سربراہ بنی ہوئی ہے۔ ہم اس
کا ثبوت دیں گے۔ آیئے نقاد صاحب۔ مَیں تھک گیا ہوں۔ لانا بھئی "کافی ہاؤس سے چائے
کا ایک کوپ۔ مَیں ابھی وہاں نہیں جا سکتا۔

اب ایک بہت موٹے تازے "جناردی گوریلا نما" آگے بڑھے: تم غزل کے شاعر ہو۔ بڑے نامی گرامی بنے بیٹھے ہو۔ ہماری طرف دیکھو۔ ہم آرام سے بیٹھ کر سوچنا پسند نہیں کرتے۔ ہم تم کو بتائیں گے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ مزدور جاگ اُٹھا ہے۔ ہم نے اس کو جگا دیا ہے۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا۔ بغیر سوچے آگے بڑھ رہا ہے۔ تمہاری غزل فنِ شعر کی ملکہ ہے۔ ہم کسی ملکہ کے ماتحت مزدوروں کو کام نہیں کرنے دیں گے۔ مزدور ہمارے لئے کام کریں گے۔ ہم نے یونین بنالی ہے۔ کیا تم نے مُنادی نہیں سُنی؟ اس منادی کا نام ہے ڈھنڈورا۔ سن لو ڈھنڈورا کیا کہہ رہا ہے۔

"غزل جو کچھ بھی ہو جیسی بھی ہو۔ جہاں بھی ہو۔ اس کو خاک میں ملا دو۔ دفن کر دو۔"

تمہاری غزل کی موجودگی ہمارے نئے فن کو آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ ترقی کرنے نہیں دیتی حالانکہ مزدور کا دور ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہم مزدور کا دَور لا رہے ہیں۔ اوہ۔ ہم تم سے کیا کہیں تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تم نے مارکس اور لینن کو تو پڑھا ہی نہیں۔ تم کتنے گھٹیا ہو۔ ہاں کامریڈو۔ مٹا دو ان کی غزلوں کو۔

یکایک چھُٹ بھیّے لپکے۔ ہمارے کئے دھرے پر اُرسرِ نو کیچڑ اچھالنے لگے۔ یہ نئے دَور کی ہولی تھی ——"

پھر ایک اَور صاحب کی آواز آئی۔ افادیّت۔ افادیّت۔ شاعری ہو۔ مصوّری ہو۔ گانا ہو۔ کچھ ہو آرٹ ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے۔ کون سا آرٹ اصلی ہے اَور کون سا نقلی؟ اصلی آرٹ وہ ہے جو رُوس سے آیا ہے۔ اس میں افادیّت ہے۔ افادیّت تمہاری زبان کا لفظ ہے۔ ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ افادیّت کا مطلب ہے "لابھ"۔

جانتے ہو "لابھ" کا مطلب کیا ہے۔ کچھ ملنا کھانے پینے کے لئے کچھ حاصل ہونا۔ اور تم محض واہ۔ واہ پر خوش رہ کر کام کرتے ہو جی —— ! تمہارے گھروں میں فاقوں کے مارے آہ آہ ہوتی ہے۔ حالانکہ آرٹ سے روٹی ملنی چاہئے۔ شراب میں گوندھی ہوئی روٹی۔ تمہاری لفظی شراب نہیں اصلی شراب ڈاڈکا۔ سفید سفید —— چاول سے بنتی ہے —— ہم چاول کھاتے نہیں پیتے

ہیں — آہا۔

ہم مزدُوروں کی ترقی کے لئے کام کرتے ہیں۔ ہم ترقی پسند ہیں۔ ہم مزدُوروں کا خون پیتے ہیں محض مزدُور کا خون گرم اور سرخ ہے۔ باقی سب کا سفید اور سرد ہے — ہم کھانے پینے کی بات کرتے ہیں۔ تمہاری غزل میں محض غم کھانا اور اپنا ہی خون جگر پینا ہے۔ ہمیں کیا فائدہ ہے۔ تمہاری غزل سے — ہم غزل کی شاعری کریں۔ تو پیٹ بھر کھائیں کہاں سے — ہماری رگوں نے مزدُور کے خوُن سے ترقی کی ہے۔ سمجھے ——— !

اب ناٹا پروفیسر بولا " افادیّت یعنیؔ لابھ" یعنی پیٹ بھرنا۔ یہ محض ترقی پسندی یعنی پروگریسو شاعری ہی سے ممکن ہے۔

"ہم انسان ہیں۔ انسان عظیم ہے۔ انسان پیٹ ہے۔ ہم پیٹ کے علمبردار ہیں۔ اور پیٹ کے لئے فی الحال اناج کی ضرورت ہے۔ پھُول پھلواری ہمارا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ غزل کی شاعری اناج پیدا کرنے کی تحریک سے خالی ہے۔ ہم وہ شاعری چاہتے ہیں۔ جو اناج پیدا کرنے کی تحریک کرے اناج۔ اناج۔ ہر وہ جنس جو اناج کو ہضم کرنے میں مدد دے۔ بس ایسی شاعری ہی اصل آرٹ ہے۔" جانتے ہو آرٹ لفظ کیا ہے۔ کہو آ۔ پھر کہو — رَٹ —"

جناب عالی اب کہاں تک بیان کروں یہ چند صاحبان ایک دوسرے کو کامریڈ کامریڈ پکارتے۔ ایک دوسرے کو پیچھے ہٹا کر خود مُکے کستے بازُو تولتے اور چیخ چیخ کر اس طرح بولتے تھے کہ بعض کی باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔ سخن فہمیٔ عالم بالا ان کے مونہوں سے ٹپکتی تھیں۔

حضور اب مناسب یہ ہے کہ میں جو کچھ ان سب کی تقریروں، لیکچروں کا ماحاصل میرے ذہن میں ہے۔ ان کی حرکتیں بیان کرنے سے اجتناب کرتا ہوا۔ ان میں سے چند بیانوں کا خلاصہ اس بیان میں شامل کردوں — !

باربار فضاان کے ارشادات سے گونج گونج اٹھتی تھی۔ ہر طرف شور تھا۔ ایک نیم برہنہ چلایا۔ روند ڈالو۔ کچل ڈالو۔ غزل کو۔ یہ پھُول ہیں۔ غزل پھُولوں کی شاعری ہے

پھولوں کی تخلیق میں لابھ نہیں۔ پھول پتیاں اناج نہیں۔ یہ تو چوُرن بھی نہیں۔ کھانے پینے کو کسی اصل چیز کو ہضم کرنے میں ہماری مدد نہیں کرتیں۔ غزل مشین اور چکی بھی نہیں۔ غزل کے پھولوں سے سرمایہ دار کا دماغ معطر ہوتا ہے۔ مزدور تو گندگی کے عادی ہیں پھول ان کو بیمار کرتے ہیں۔ ہم مزدور کو بیمار نہیں ہونے دیں گے۔ ہم کو مزدور درکار ہیں اور ان کا سُرخ خون۔"

"چلا دو رُوسی گدھوں کے ہَل غزل کی شاعری پر۔ یہ غزلیں پھولوں کے تختے ہیں۔ زعفران کے کھیت ہیں۔"

"زعفران کا رنگ کندن سونے کا رنگ ہے۔ جس کا تعلق سرمایہ داروں سے ہے۔ یہ سونا سرمایہ ہے۔ ہم اس کو چھین لیں گے۔ ہم سونا چھین کر اپنے مزدوروں کے لئے اپنی نگرانی میں وُہ سب کچھ بنائیں گے۔ جو ہمیں ترقی کے لئے پسند ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ بریانی اور زردہ کیا ہے ــــ یہ سرمایہ داروں کی خوراکیں ہیں؟ تمہیں معلوم ہے تو پھر تم زعفران کیوں پیدا کرتے ہو"؟

"یہ تم کیا بکتے ہو۔ گُل گُل۔ لالہ لالہ۔ چھی۔ یہ گُل گُل لالہ لالہ ہمیں درکار نہیں ہم کو لہُو کا پیالہ چاہئے۔ یہ گُل پھول تو امیری کے چونچلے ہیں۔ یہ پھول پتی سرمایہ داروں ــــ پیسے والوں کی آنکھوں کو تراوٹ اور دماغ کو تازگی دیتی ہے۔ اس پھول پتی جڑی بوٹی سے دوائی اور مقویات بنتی ہیں جو اعضائے رئیسہ کو تندرست رکھتی ہیں۔

"اعضائے رئیسہ" یعنی "رئیسوں کے اعضا" ان مقویات کے بَل پر مضبوط ہیں۔ جی ہاں اسی لئے تو رئیس یعنی سرمایہ دار لوگ زندہ رہتے ہیں۔ گُل قند سے مزدور کا کوئی تعلق نہیں ــــ اسی لئے تو ہم گلاب کے پھولوں کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ غزل کیا ہے۔ یہی پھول ہیں نا ــــ ہم چنپا۔ چنبیلی۔ یاسمین پیدا ہی نہ ہونے دیں گے۔ ان سے گجرے اور ہار بنتے ہیں۔

"گجرے اور ہار۔ چھی" یہ سب کچھ سرمایہ داری ہیں۔ دوائیں سرمایہ داری۔ عطر

سرمایہ داری کی سب رجعت پسندی لوٹ کھسوٹ ہے۔ انسانیت سے ان کو کیا واسطہ۔ ہم صرف کانٹے پیدا کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ تاکہ اناج کے کھیتوں کی حفاظت ہو سکے پھول نہیں ہرگز نہیں۔ پھول نہیں۔ ببول۔ اناج۔ اناج۔

روس نے شعر کی سرزمین کو اناج کے لئے جوتنا لازم کر دیا ہے ــــ یاد رکھو جہاں کہیں بھی پھول اُگتے ہیں۔ دواؤں اور خوشبوؤں کے لئے لگائے اور اُگائے جاتے ہیں۔ ایسی سرزمینیں دھبہ ہیں انسانیت کے دامن پر ــــ!" ہم ایسی زمینوں کے دھوئیں اڑا دیں گے۔ ہم انقلاب چاہتے ہیں۔ ہم ہی تو انقلاب ہیں۔ تم دیکھتے نہیں ہماری شکلیں ــ ہم پھولوں اور خوشبوؤں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جڑی بوٹی ایسی پھول پتی سے بنی ہوئی دوائیوں سے ہمیں گھن آتی ہے رنگا رنگی ہمیں ناپسند ہے۔ خیال کی ہو یا اعمال کی یا لباس کی۔ رنگا رنگی پُرانی دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ خوش رنگی امارت کی نشانی ہے۔ خوش رنگی۔ رنگا رنگی سے پیدا ہوتی ہے ــ دیکھو۔ اسی لئے ہم اس کے مخالف ہیں۔ غزل ہی نے تو سب سے پہلے دُنیا میں رنگا رنگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ رنگا رنگی "تگ جُل" ہے ــــ ہی ہی ہی ہی۔ رنگا رنگی ــ! تگ اور جُل ــ دھوکا فریب ــــ'

دوسرا بولا :۔ کامریڈو خوشبوئیں کیا ہیں۔ مزدوروں کو مدہوش کر کے غلام رکھنے کی ترکیبیں جو لوگ خوشبوؤں کے عادی ہیں۔ سرمایہ داری کی لوٹ کھسوٹ میں مدد دیتے ہیں۔ خوشبو ہو یا رنگا رنگی۔ سب قابلِ نفرت ہیں۔ ان میں افادیت کا نشان تک نہیں۔ ہم عوام کے شاعر ہیں۔ ہم پیٹ بھرنے اور کھانے پینے کی بات کرتے ہیں عوام سیدھی بات نہیں سمجھتے غزل اگر سیدھی سادی ہو۔ تو اور بھی قابلِ نفرت ہے۔ کیونکہ اس میں تروتازہ پھول اور پتیاں پتے پائے جاتے ہیں۔ ہمیں تروتازگی کی ضرورت نہیں۔ مزدور کبھی تروتازہ نظر نہیں آتا۔ غزل میں باجرے کے دانے کہیں نظر نہیں آتے اور چونکہ اس کے بول دل و دماغ کے لئے دوا بنتے ہیں اور سرمایہ داری کو زندہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم غزل پیدا ہونے نہیں دیں گے (آوازیں آئیں

ہرگز نہیں کبھی نہیں)

اب پھر سب سے پہلے لیکچرار صاحب نے بولنے والے کامریڈ کو کندھے سے پکڑ کر دھکیل دیا اُن کو مُکّہ دکھایا اور فرمایا :-

غزل ہمارے مرض کا علاج نہیں ہے ۔ ہماری ضرورت بھوک ہے ۔ بھوک ایک عام انسانی ضرورت ہے ۔ ساتھ ہی جنسی جذبات بھی ایک اور انسانی ضرورت ہیں ۔ ہم انسان ہیں ۔ ہم بھوک اور جنس سے پابندی ہٹائیں گے ۔ جنس کے تذکرے کی یہاں زیادہ حاجت نہیں ۔ ہم ترقی پسند اپنی نظم میں اس کا تذکرہ کریں گے ۔

یہ نظمیں تم خود پڑھ لو گے ۔ سمجھ میں نہ آئیں ۔ تو ہمارے دوسرے کامریڈ نقّاد صاحبان سمجھا دیں گے ۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم پیٹ ہیں ۔ ہم کھاتے ہیں اور کھانے کے بعد جو حرکت کرتے ہیں ۔ اُسی سے زِندگی پیدا ہوتی ہے ۔ یہ زندگی ہمارے پیٹوں سے کھیتوں میں بھی جاتی ۔ موہنوں سے نکل کر ہوا میں دندناتی ہے ۔ ہم پروفیسر ہیں ۔ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ زندگی تعفّن سے پیدا ہوتی ہے ۔ ہم تعفّن پیدا کرنے کے لئے اٹھے ہیں ۔

ناک بھوں نہ سکیڑو ۔ ہم نے تعفّن کا عوامی ترجمہ بھی کر لیا ہے ۔ تعفّن کا ترجمہ ہے سڑاندھ نئی دنیا بنانے کے لئے سڑاندھ پیدا کرنا ضروری ہے ۔ ہم پیٹ بھریں گے اور سڑاندھ ضرور پیدا کریں گے ۔ یہ ہمارا پیدائشی حق ہے ۔ تاکہ زندگی پیدا ہو ہر نئی زندگی تعفّن کی اولاد ہے ۔

"نئی زندگی کے لئے سڑاندھ اور سڑاندھ کے لئے پیٹ بھرنا لازمی ہے ۔ تو ثابت ہوا کہ اناج درکار ہے ۔ غزل کی انسانوں کے لئے کوئی ضرورت نہیں ۔ ہم ایسی شاعری کرتے ہیں جس سے عفن یعنی نئی زندگی کے لئے سڑاندھ پیدا ہو ۔"

اس تقریر کے ساتھ یہ کامریڈ صاحب کھانسنے لگے تو ایک اور نے یکایک ان کی جگہ لے لی اور ہماری طرف سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے چیخنا شروع کیا :-

کیا تم جانتے ہو میں کون ہوں - اوہ تم کیا جان سکتے ہو - مَیں ہوں نقّادوں کا استاد ہُن تم کو بتانے آیا ہوں - اِنسان کیا ہے - زِندگی کا خالِق - زندگی کیا ہے بُھوک ہے - بُھوک جنسی ہو یا مادّی ایک ہی بات ہے - یہی دو دنوں اصل ہیں - باقی فرُوع - یاد رکھو - خوراک اور سٹراندھ ہی سے اصل شاعری پیدا ہوتی ہے - نئی شاعری ترقی کی شاعری —" جی — !

تُم ہماری شاعری کو غیر موزوں اور بے معنی سمجھتے ہو - اب ہم لائیں گے تم کو راہ پر - یا تُم کو ختم کر دیں گے - تمہارا نام تک نہ آنے دیں گے - تم ہماری تنقید سے بچ نہیں سکتے - دیکھو ہمارے شاعر عوام کے لئے شاعری کرتے ہیں - ہماری اشتراکیت افادیّت چاہتی ہے - آرٹ کا اَفادیت ہی مقصد ہے - یعنی شکمی اور جنسی بھوک کو مطمئن کرنا - پیٹ اور جنسی بھوک کے مطمئن کر دینے کے بعد جو کچھ ظہور میں آئے - ہر بات زندگی ہے - شرط یہ ہے کہ اس میں نہ رنگ ہو نہ خوشبو بھُول گل کاریاں فضول باتیں ہیں - ان کے تاثرات بیکار اور بیکار محض ہیں اور یہی سب غزل ہیں - ہم غزل کو زندہ رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے - ہم نے نئی شاعری نکال لی ہے - اینٹوں کی شاعری - گارے کی شاعری ہم مزدُور کے شاعر ہیں - ہم عوام کی زبان میں بات کرتے ہیں ہماری بولی سرمایہ داری کی نرم لچکدار بولی نہیں - ہم نفاستوں کے قائل نہیں - جب ہماری زندگی میں نفاست نہیں ہے - تو آرٹ میں کیوں ہو گفتار اطوار و کردار میں کیوں ہو - ہم جذباتی لوگ نہیں ہیں -

نقادوں کے استاد اب جوش میں آ گئے - ایک سگریٹ کا لمبا کش لیا - چرس کی بُو پھیلی اور چیخے - ارے او پرانی طرز کے شاعرو - ادیبو - غزل کی تخلیق کرنے والو - تم رجعت پسند ہو - تم جذبات پیدا کرتے ہو اور جذبات سے کھیلتے ہو - تم تو انسانیت کے دامن پر پھول ہو - پھول کا قافیہ ہے بجھُول - ہاں دُھول بھی ہے - تم غزل نہیں بناتے پھُول اگاتے ہو - پھلواریاں سجاتے ہو - مزدُور کو شاعری کی دھُول میں نہلاتے ہو - تمہاری غزلیں - محض پھول پھلواریاں - بیچاریاں ہیں - دیکھو ہم تم سے بہتر قافیہ پر قافیہ مار سکتے ہیں - تم موسیقی پیدا کرتے ہو - ہم ہتھوڑے کی ضرب لگاتے ہیں - ہم انقلابی شاعر ہیں -

بے وقوفو ـــــ تم نے انسانی دل و دماغ کو خوشبوؤں اور رنگوں سے بھر دیا ہے حالانکہ انسانی پیٹ میں کچھ اور ہوتا ہے۔ پیٹ کو خوراک کی ضرورت ہے۔ اور انسانی دماغ کو ہتھوڑے کی۔

اب ایک بہت دُبلا پتلا بہت ہی اُلجھے ہوئے بالوں والا ناک نکتا ہوا آگے بڑھا۔ مَیں تم سے کہتا ہوں۔ میرے سب کامریڈ مجھے تنقید کے لئے چُن کر لائے ہیں۔ ہم یہ کہنے کو نکلے ہیں کہ تمہاری غزل کوئی آرٹ نہیں۔ اگر ہے تو نقصان رساں۔ دشوار گذار۔

یاد رکھو رنگ و خوشبو اور تاثر کے لئے نئی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ آرٹ وُہ ہے جس سے پیٹ پلے اور سڑاندھ چڑھے۔ سڑاندھ نئی زندگی کے لئے جس قدر ضروری ہے وہ بیاں کیا جا چکا ہے۔ تمہاری غزل سڑاندھ پیدا نہیں ہونے دیتی۔ یہ غزلیں تصور میں لاتی ہیں پھول پتی جڑی بوٹی کو جن سے صرف پیسے والے لذت یاب ہیں اپنے امراض دُور کرنے میں کامیاب ـــــ!

غزل سڑاندھ پیدا نہیں کر سکتی۔ غزل مزدُور کے کسی کام کی نہیں۔ غزل میں مٹر کا دانہ تک نہیں۔ اور ہم مٹر کے دانے چاہتے ہیں۔ ہر طرف لڑھکنے والے ؏

کچن میں آج پک جائے مٹر یا آرزو دارم ''ہہ ہہ''

اے غزل پیدا کرنے والے شاعر تم باغبان ہو۔ مالی ہو۔ ایسے باغوں کے ایسی بہاروں کے مالی ہو۔ جو گلزاروں میں ہوتی ہیں۔ تم کسان نہیں ہو۔ تم کھیت نہیں جوتتے۔ تم اناج پیدا نہیں کرتے۔ ہم تمہیں اناج کے لئے کھاد بنانا سکھائیں گے۔ یا تم کو کھاد بنا دیں گے۔ ہا ہا ہا۔

اب ایک اور بھینگے صاحب آئے:۔ سب سے پہلے ہم تم سے نمٹنے کے لئے اٹھے ہیں ہم سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کا سارا غصّہ تم پر اتار دیں گے۔ یہ تمہاری غزلیں ہی تھیں کہ ہم میں سے چند ساتھیوں کو ایم۔ اے پاس کرنا نصیب نہ ہُوا۔ بعد میں بھی ہر دفتر سے ''نو ویکینسی'' کا جواب ہی ملا۔ اب بڑی آس سے ہم نے پی ایچ ڈی بھی مروڑ لی ہے۔ نئی دنیا ئے

انقلاب کی خوش نصیبی اور پرانے اخلاق کی بدنصیبی ہے کہ کالجوں میں کسی نہ کسی طرح ہمارے یہ کامریڈ ریڈر اور لیکچرار بن گئے ہیں اور پروفیسر کہلاتے ہیں۔ پھر ان کے درس وتدریس اور فیضِ صحبت سے سب جواں ہمت نوجوانوں کو تعلیم ترک کر دینے کی جرأت ملی ہے — دیکھ لو۔ نوجوانوں نے سروں کے بال بڑھا لئے ہیں۔ ہم کنگھی نہیں کرتے۔ ہم کانوں کی لوؤں کے نیچے تک بالوں کی لمبی لمبی قلمیں رکھتے ہیں۔ جیسے جوتی بنانے والے مزدور کی کھرپی۔ یہی ہے انقلابی شاعروں اور فن کاروں کی وضع قطع۔ ہم صرف وضع قطع میں یقین رکھتے ہیں۔ دیکھو میں نے "میں" یقین کہا ہے "پر" یقین نہیں کہا۔ یہ ہے نئی بولی۔ ہم درسگاہوں میں نہیں کافی ہاؤسوں میں نئی زندگی کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ ہمارا عرفان بدھ مت کا گیان ہے —!

"تمہاری غزلوں کی نام نہاد نفاست نے حکومت کے کارندوں کے دل و دماغ میں حلول نہ کیا ہوتا۔ تو وُہ ہمارے ایم اے پاس ساتھیوں کو ڈپٹی کنسٹر بننے کا اہل شمار کرتے۔

خیر یہ اچھا ہی ہوا۔ اس طرح ہم سب انقلابی ادیب اور نقاد بن گئے ہیں۔ نئے ادب کے مُوجد قرار دیئے گئے۔ دیکھو جی ہم سے ڈرو نہیں ہم تم کو جان سے نہیں ماریں گے۔ البتہ تمہاری یہ غزل کی شاعری۔ یہ گیت۔ یہ نغمہ و نالہ ختم کر دیں گے۔ یہ تمہاری غزلیں جذباتی دوائیں اور شفائیں ہیں عطر پھلیل کے کنستر ہیں۔ ہم ان سب کو تمہاری آنکھوں کے سامنے تباہ کر دیں گے۔ اور تم کو اجازت نہیں دیں گے۔ کہ خوشبوؤں رنگوں اور ادویات کے بہانے تم ہماری نئی دنیا میں سرمایہ داری کے دور کو قائم رکھو — یہاں نقاد صاحب کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

پانی لاؤ فرمایا۔ پانی نہیں ملا تو وہ ہٹ گئے دوسرے بولنے لگے:۔

ڈرو نہیں ہم تم کو مفید کام کرنا سکھائیں گے۔ تم صرف ہماری طرح اناج کے کھیتوں میں کھاد بنانے کا کام کیا کرو گے۔ یا آٹا پیسو گے چکیوں میں "کھٹ بڑھئی" بنو گے۔ نئی دنیا کو غزل کے شاعر درکار نہیں ہیں۔ چکی کے دونوں پاٹوں دونوں پتھروں کے لئے چکی راہا ہے۔ یعنی کھٹ بڑھئی کی ضرورت ہے۔ قلم کی نوک سے چکی راہنا ہی فنکاری اور شاعری ہے۔

دیکھو ہم تم کو چکی راہ کر دکھاتے ہیں۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹا کھٹ۔ کھٹ کھٹ۔ کھاٹ۔ کھٹ دکھیایہ ہے۔ آرٹ۔ ہم عوام کی بولی میں بات کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بولی تمہاری سمجھ میں اور عوام کی سمجھ میں بھی آنے لگے گی۔ ابھی تمہارے کان اور ہمارے مزدوروں کے کان اس بولی سے مانوس نہیں ہیں۔

اب ایک اور صاحب بہت غصے میں بڑھے اور پہلے لیکچرار کو مُکا دکھلایا پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

ہم یہ اصطلاحات پسند نہیں کرتے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ ہمیں ابھی پرانی زبان سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا۔ اور یہ بھی تم غزل گو شاعروں ہی کی خطا ہے۔ تم نے پرانی زبانوں کے الفاظ اس طرح دل و دماغ میں بسا دیئے ہیں۔ کہ وہ اصطلاحیں بن گئے ہیں۔ میرا کامریڈ تم لوگوں کو یہ بتا رہا تھا۔ کہ تم کھٹ بڑھئی یا چکی راہے بن جاؤ۔ تم "انٹ لیکچرئل" کہلاؤ گے تم ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گے۔ "ترقی پسندوں" کے نقادوں سے تحسین پاؤ گے ——

آہا ترقی اور پسند! پسند اور ترقی۔ تمہاری اپنی اپنی پسند کی نہیں۔ یہ ترقی وہ ہے جس کو ہم پسند کریں۔ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ ہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ترقی اگرچہ عربی کا لفظ ہے اور عربی زبان قرآن کی بولی ہے۔ اور قرآن سے مذہب اور خدا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے ترقی کے ساتھ پسند لگا دیا ہے۔ پسند کے بہت سے معنے ہیں۔ خاص طور پر پسندے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ پھ

جگر کے کوفتے دل کے پسندے

اگرچہ یہ پسندے اور کوفتے مزدور کو نہیں ملتے۔ لیکن ہم نے کھائے اُڑائے ہیں تکّے بھی۔ جب مزدور یونین بناتے ہیں تو ہمیں پسندے اور کوفتے کھلاتے ہیں۔ "ڈرنک" کا انتظام ہم خود دعوت کرنے والے سرمایہ داروں سے کرا لیتے ہیں۔ ہہ ہہ ہہ۔ ہم اور وہ لوگ بات کو سمجھتے ہیں ترقی پسند سرمایہ داروں کی ضیافت پر یہ دونوں چیزیں نُقل کے طور پر تمہاری غزل کی

طرح سجا کر بوتلوں کے اردگرد رکھی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم ترقی کے ساتھ "پسند" لگا کر پسندوں کی یاد سے مزدوروں کے دل و جگر کو تقویت مہیا کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے مزدور کوفتہ خود بخود بن جائیں گے۔ کوفتہ بیختہ تمہارا لفظ ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم مزدوروں کے لئے یہی استعمال کرتے ہیں۔ کوفتہ بیختہ !

اب پھر وہ پہلے نقادوں کے اُستاد صاحب بولے :۔ دیکھو ہماری ترکیب حاصل کرو۔ ہم جس چیز کو ہم فی الحال بدلنا نہیں چاہتے۔ یا بدل نہیں سکتے۔ اُس کو بگاڑ دیتے ہیں تاکہ وُہ نئی بن جائے۔ نئی دُنیا اسی کا نام ہے۔ "بگاڑ ہی بناؤ ہے"۔ میں تم کو نرمی سے سمجھاتا ہوں کہ ہم یہ توڑ پھوڑ بلا وجہ نہیں کرتے۔ لیجئے ایک شعر یاد آگیا۔ اگرچہ یہ شعر کمبخت غزل کا ہے۔ ؎ مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اس شعر سے ثابت ہے۔ کہ ہم لوگ مُغاں ہیں۔ ہماری پیروی کرو۔ تم لوگ پیر مُغاں کے پیچ میں کب تک رہو گے۔ تم لفظوں کی شراب میں غرق ہو۔ آؤ تم کو اصلی پلائیں۔ واڈکا۔

اب ایک اور لیکچرار بولا۔ اُستاد جی مجھے بھی کہنے دو۔ آہ یہ غزل کتنی وبالِ جان ہے دیکھا اس کا ایک کانٹا۔ یہ شعر کس طرح ہماری رگوں میں پھنسا ہوا رہ گیا ہے۔ بہر صورت ہم نے تمہارا حربہ تمہیں پر استعمال کر دیا ہے۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ حربہ کوئی بھی ہو۔ ہم استعمال کر لیتے ہیں۔ ہم حربہ استعمال کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ دیکھو یہ ہتھوڑا اس سے ہم ضرب لگاتے ہیں۔ اور یہ درانتی اس سے ہم کاٹتے ہیں۔

اچانک بہت دور سے پھر اک شور سنائی دیا۔ مجنونانہ مُسرّت کے نعروں میں یہ چند الفاظ گونج رہے تھے۔ غزل ماردی گئی۔ غزل کو دفن کیا جا رہا ہے۔ آؤ ساقیو سب مل کر غزل کو دفن کریں۔ اور آزادی کا سرخ گیت گائیں۔ ساقیو۔ آجاؤ قبریں بن رہی ہیں (سُرخ گیت گائیں گے۔ ہم آزادی کا دَور لے کر آئیں گے ہم بربادی کا ——— ۔

. بادی کا۔ آزادی کا)

اس وقت تک ہم بے چارے۔ مَیں اور میرے چند معاصرین۔ ایوانِ اُردو کے مستری محنتی مزدور۔ انجنیئر اِن ترقی پسندوں کی دھونس کے سامنے پہلے ہی سہمے ہوئے تھے۔ اب ہم نے ایک دوسرے پر حیرت ہی نہیں عبرت کی نگاہیں ڈالیں۔ ! ڈر کے مارے مسکرائے نہیں۔ سر جھکائے بیٹھ گئے۔

محاسب بندہ نواز و ——— ! جب یہ نقّاد صاحبان یہ نئے شاعر اپنے ارد گرد کے ترقی پسندوں کو ساتھ لے کر لیکچر دینے والے "پروفیسر" حضرات کو ساتھ لے کر غزل ماردی گئی کی پکار پر ہتھوڑے اور درانتی کی جھنڈیاں ہلاتے ہوئے قبرستان کی طرف چل دیئے۔ تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹھنڈی آہیں بھریں۔ ہمارے کئے ہوئے کام پر جو کیچڑ تھپا ہُوا اور خاک پڑی ہوئی تھی۔ ہم اس کو صاف کرنے میں لگ گئے۔ یہ تھا اصل واقعہ ——— !

حضور محاسب صاحبان یہ سوال کہ آیا۔ غزل کی اہمیت ختم ہو گئی ہے ؟ اس کا جواب کیا عرض کروں۔ ! کہہ تو چکا ہوں۔ کہ تغزل ہی میرا فن ہے۔ میں غزل ہی کا تو شاعر ہوں اس کے علاوہ اور مَیں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اگر آپ اصرار ہی فرماتے ہیں۔ تو لیجئے مَیں اپنی ذاتی رائے عرض کئے دیتا ہوں۔

مجھے اناج اور اناج کے لئے کھاد کی ضرورت سے انکار نہیں چکیاں راہنے کے لئے کھٹ بڑھئی بھی لازمی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کسی شوقین کسان نے نئے ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے اناج کے کھیت جمالیات کو ملحوظ رکھ کر اُگائے اور چکّی راہا۔ اگر ذوقِ نغمہ سے سرشار ہے اور اس نے پتھر پر تیشہ آہنیں کی ضرب لگاتے وقت اپنے کانوں کے لئے موزوں آوازیں پیدا کر لیں۔ تو شائد دونوں فردوسِ گوش اور جنتِ نگاہ کی تخلیق کے مجرم گردان لئے جائیں۔ آنکھوں کے لئے کھیتوں کی موزونیت کانوں کے لئے ہتھوڑے کی آوازمیں نغمے کی کیفیت کیا ہے ! کیا یہ تغزل نہیں کیا یہ معمولی سی بات بھی اِن استاد

نقادوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

لیکن غزل کے بارے میں تو اعلان ہو ہی چکا ہے۔ کہ وُہ مر چکی ہے۔ اگر غزل مر چکی ہے یا مار ڈالی جا چکی ہے۔ تو یقیناً تغزّل بھی جو غزل کی روح تھا۔ عالمِ سفلی سے عالمِ بالا کو سدھار چکا ہو گا۔

رہ گئی غزل کی اہمیت" یا " "افادیت" یا غزل کے لئے "ذوقِ طلب" جو کچھ بھی آپ اس اہمیت کو قرار دیں۔ مجھے معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ ممکن ہے غزل کے ساتھ غزل کی اہمیت بھی مار ڈالی گئی ہو شائد یہ سمجھ کر چھوڑ دی گئی ہو۔ کہ بے چاری نقادی کی ماری خود بخود مر جائے گی۔ لیکن اگر وہ زندہ ہے۔ تو کبھی نہ کبھی اس کا اتہ پتہ معلوم ہو ہی جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر زندہ ہے۔ تو لاکھوں کروڑوں دلوں میں وہ پناہ گزین پائی جائے گی۔ لیکن میں اس بارے میں علانیہ کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں وثوق سے کچھ عرض کردوں کہ وہ زندہ ہے۔ تو ممکن ہے۔ کہ ادب کی تعفن والی نئی دنیا بسانے والے کامریڈ پھر لپک پڑیں اور ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں دلوں کو چیر کر غزل کی اہمیت کو بھی پھانسی پر لٹکا دیں۔

مزید گزارش یہ ہے۔ کہ مَیں اور میرے چند معاصرین۔ ان معنوں میں تو کبھی ترقی پسند نہیں ہو سکتے۔ جن معنوں میں لیکچرار یا پروفیسر صاحبان نے ہمیں " بننے " کی تلقین کی تھی۔ ہم چکنی راہ پن یا کھٹ بڑھئی پن اختیار کر بھی لیں۔ تو اناڑی ہی رہیں گے۔ جو کچھ بھی ہم سے ظہور میں آئے گا۔ غزل نہیں تو تغزّل ضرور ہو گا۔ جو میرے نزدیک ایک ہی بات ہے۔

انکوائری کمیٹی کے بزرگو مَیں دوسروں کے بارے میں رائے نہیں دے سکتا۔ اپنی صورتِ حال بیان کر دیتا ہوں۔ کہ مَیں اب اس عمر میں کھٹ بڑھئی شاعر بننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ چکنی راہ نا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نظم لکھوں یا گیت۔ تغزل

کے بغیر نہیں لکھ سکتا۔

اب بھی جذبات کی صورت میں میرے نہاں خانۂ قلب میں بہت کچھ موجود ہے جب تحقیقات ختم ہو چکے اور کمیٹی کسی نتیجے پر پہنچ جائے۔ اور فیصلہ صادر فرمانے لگے تو مجھے بھی یاد فرما لیجیے گا۔ شائد میں غزل کی اہمیت پر مزید روشنی ڈال سکوں۔

فدوی حفیظ جالندھری

ہمارے تمدّنی دوزخ اور بہشت

شہر قصبے۔ بستیاں دیہات جہاں ہم رہتے بستے ہیں۔ ہماری تمدنی آبادیاں محلّے ہیں بازار ہیں گلیاں کوچے ہیں اور ان سب کے اندر ہی اندر اِدھر سے اُدھر مُڑنے کے کونے ہیں۔ بازار ہوں یا گلیاں کوچے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں ایک دوسرے سے ملتے بھی ہیں سب میں داخل ہونا سب سے خارج ہونا یہ ہماری زندگی اور اس کے کاروبار ہیں۔ یہ سب رستے ہیں ان راستوں پر ہم چلتے پھرتے ہوئے جیتے رہنے اور اپنے متعلقین کو جیتے رکھنے میں لگے رہتے ہیں دکاندار بھی خریدار بھی صنعتکار بھی اور صنعت سے طلبگار بھی یہ ہے ہمارا تمدن۔ ہم کون ہیں؛ عوام الناس۔ شہری ہوں یا قصباتی دیہاتی ہمارا ہی نام عوام ہے۔

ہم ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں۔ ایک دوسرے میں شامل بھی۔ ہم انسان کہلاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے صُلح پر بھی عامل رہے ہیں کسی نہ کسی صورت میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ بھی ہم میں ہے۔ ہم سوسائیٹی بنا کر رہنے والے جاندار ہیں۔ ہمیں حیوان ناطق کا بھی نام دیا گیا ہے ہم عوام الناس کے خیالات۔ فرقے۔ زندگی کے مقاصد اگرچہ سب کے الگ الگ ہیں نظر ایسا ہی آتا ہے لیکن ہمارا رہن سہن گتھا ہوا ہے۔ ہم کو عوام الناس کا نام جن آدمیوں نے دیا ہے۔ ہم نے ان کو خاص آدمی اور اپنے آپ کو عام آدمی قبول کر لیا ہوا ہے جب عوام کا لفظ پکارا جائے یا لکھا ہوا پایا جائے تو آپ اور ہمیں ہم سب مخاطب ہیں یہ ہے تمدن کی ایک صورت عوام الناس کا تمدن۔

تمدن کی دوسری صورت۔ باغات ہیں پارک ہیں بنگلے ہیں۔ شاندار کوٹھیاں ہیں پھول پھل آرائشیں زیبائشیں ہیں۔ یہ ہماری گتھی ہوئی دُنیا سے الگ دُنیا ہے۔

اس دنیا کے رہنے والے ہیں تو شکل و صورت سے ہم عوام جیسے انسان ہیں۔ لیکن یہ خود کو اپنی زبان سے بھی کہتے ہیں اور ہم سب سے بھی خواص الناس کہلواتے ہیں۔ یہ عوام الناس میں شامل ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور نہ ان کی زبانوں سے ہم کو انسانوں کی طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔

عوام الناس کے گلی کوچے بازار سڑاندھ، گالی گلوچ شور و شر سے بھرے رہتے ہیں۔ لیکن خواصُ النّاس جہاں رہتے بستے ہیں وہاں سکون اطمینان اونچی آوازوں کی مناہی ہے باغات میں عوام الناس ہی میں سے مالی، پھول پھل شجر اور سبزہ کی زیبائش کے لئے چند پیسوں پر ملازم ہو کر اپنا کام انجام دے کر پھر اُسی سڑاندھ کی فضا میں اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگیاں گزارتے ہیں۔

خواص الناس کے شوفر چپڑاسی پہرہ دار وغیرہ بھی آپ ہم میں سے ہیں خواص کو آرام کی ہر چیز مہیا کر دینے کے بعد اپنی اس گندی دنیا میں آ رہتے ہیں جس کو عوام الناس کا تمدن عرف کیا گیا ہے۔ کسی زمانے میں انسان ایک نوع کہلاتی تھی۔ اُس دور میں عوام اور خواص دو طبقے نہیں تھے۔ اس دور میں تعلیم بھی ایک ہی جگہ، ہُوا کرتی تھی۔ ایک ہی جگہ کے علاوہ تعلیم کا مقصود بھی ایک تھا۔ وہ واحد مقصود یہ تھا کہ نوع انسانی ایک برادری کا نام ہے ان میں کوئی خاص اور ناخاص نہیں یعنی کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا۔ رفتہ رفتہ تفریق پیدا کی گئی دوسروں کی کمائی اور دوسروں سے اپنے کام کرانا چند آدمیوں نے شروع کر دیا۔ یہ فلنہ بڑھتا اور ترقی کرتا ہوُا۔ زمین پر ہی ایک طبقہ بڑا طبقہ دوزخی دوسرا جنتی بن گیا

دوزخی شہروں کی گلیوں میں گُھٹی ہوئی کوٹھڑیوں جھونپڑوں یا مکانوں میں آباد ہیں لیکن کوئی ایسی آبادی نہیں۔ کوئی کوچہ کوئی بازار کوئی جھونپڑا اور کوٹھا ایسا نہیں جس کے ارد گرد گندگی

کے ڈھیر یا گندے پانی کے گڑھے نہ ہوں سڑاندھ سے یہ وہ بیماریاں مہیا کرتے ہیں جو ہوا کے ذریعے نتھنوں سے عوام الناس کے سینہ، دل وجگر تک پہچانے کی خدمت بلا معاوضہ انجام دیتے ہیں دونوں طبقوں کی الگ الگ تعلیم گاہیں بھی اپنے اپنے بہشت اور اپنے دوزخ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بہشتی طبقے کے اسکول کانونٹ اور اونچے درجوں کے کالج ہیں۔ اگرچہ ان کانونٹ اسکولوں اور کالجوں کی زمین ان کی عمارتیں عوام الناس ہی کے خون اور ہڈیوں سے اور عوام الناس ہی کی کاریگری سے تعمیر ہوئے ہیں لیکن تعمیر کر دینے کے بعد ان کے بچوں کو کسی طرح بھی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتے تعلیم کیا معنی ان کا داخلہ بھی اُس بڑے پھاٹک کے اندر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ دوزخی تمدن والے کا وجود اتنی بلندی کو پستی کا بیہودہ منظر دکھائی دیتا ہے۔
ہمارے پاکستان میں بعض اسکول گورمنٹی کہلاتے ہیں بعض اسلامیہ یا عامیہ قسم کے نام رکھتے ہیں گورنمنٹ سکول ہوں یا اسلامیہ ہوں سب عوام ہی کی کمائی سے بنتے ہیں۔ عوام کا اجڑنا ان اسکولوں کا بناؤ تناؤ ہے یہ عمارتیں اور ان کے اندر یا باہر جو کچھ ہے سب کروڑوں عامی انسانوں نے اپنے لہو پسینے سے تعمیر کیا ہے۔ کالج انٹرمیڈیٹ ہوں یا ڈگری سب عمارتوں میں اینٹیں اور گارا عوام ہی ہیں۔
کتنے سر بفلک ہیں عوام کے وجود دیکھا آپ نے ۔ لیکن آپ کو ان کی طرف آنکھ اُٹھانے کی بھی جرأت نہیں۔ آپ ہیں کون۔ گندگی کے شکار۔ افلاس کے شاہکار۔ ان اسکولوں کے ماسٹر و ہیڈ ماسٹر پرنسپلوں کو صاحب آپ ہی کی کمائی نے بنایا ہے ان ہی صاحبوں سے آپ جاہل اور کندہ ناتراش کہلواتے ہیں جن کو آپ کی دن رات کی کمائیوں نے نہیں ہزاروں طریق سے چھنوا کر اُستاد وغیرہ بنایا ہے۔ آپ سے کہا گیا تھا کہ لاؤ روپیہ

اسلام کے نام پر لاؤ۔ دھونس کے رُعب سے دو یا خوشی سے دو تاکہ تمہارے بچوں کو
تعلیم دے کر مہذّب بنایا جائے۔ ہاں لیکن عوام الناس۔ انسان ہی سہی۔ ہیں
تو وغیرہ وغیرہ نا۔ یعنی محنتی مزدور۔ کسان کنجڑے۔ بڑھئی۔ معمار درزی تیلی۔ بھڑبھونجے
دھوبی نائی۔ بجاج، دکاندار قسائی خوانچے والے چیزیں بیچنے یا بنانے والے۔ صنعت
وحرفت کرنے والے تاجر۔ بلکہ کرخندار۔ موچی۔ لوہار۔ چوہڑے چمار کھٹیک
حلوائی نانبائی پان فروش۔ پھیری لگا کر سودا سلف بیچنے والے سر پر رکھ کر ٹوکریاں
ڈھونے والے پیشہ ور۔ آپنے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے پیسے دے دے کر کیا کچھ
نہیں بنوایا۔ لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ یہ اسکول یہ کالج کس کے ہاتھوں میں ہیں۔ کیا اُن
کے ہاتھوں میں ہیں جو آپ پر واقعی مہربان ہیں۔ یا اُن کے ہاتھوں میں۔ جن کو آپ نے
اسلامی روایات کا مُنہ چڑاتے رہنے والی افرنگی تعلیم و تہذیب اور ترقی کا سامان مہیا
کیا اور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ ہی نے انکو وُہ سب کچھ دیا ہے جس سے وُہ فردوس
بر روئے زمین کے مسکن بنے ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہیں وہی ہیں جو انگریزی تاج کو
آپ کے ملک پر قائم رکھتے رہے۔ انہی کے وجود نامسعود سے انگریز آپ کے خون
کو شرابِ ناب کی صورت دے کر اور آپ کے گوشت کو کباب کی مانند بھون بھون کر گزک
چکھتے رہے۔ اور اب ان ہی کے ذریعے اپنے ملک میں بیٹھے آپ ہی کا دیا کھا رہے ہیں
کھا بھی رہے ہیں آپ کو کاٹ کھانے کے لئے غرّا بھی رہے ہیں

ابتک اسی گھرانت کے چند ہزار آپ کے مہربان آپ سب کروڑوں مسلمان
مرد و زن کے سروں پر چڑھے ہوئے ہیں اور اپنی حرکات کو اُسی کوڑھ کی کھاج بنائے
ہوئے ہیں۔ جو کوڑھ انگریز نے آپ کے معاشرے اور تمدن میں انہی ذہنی کوڑھیوں

کے ذریعے پھیلایا تھا۔ کیا آپ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے سمجھ گئے۔؟ جی نہیں۔ آپ میں سمجھ کہاں رہنے دی گئی ہے بات تو سیدھی سی ہے کہ انگریز نے ہم مسلمانوں میں سے چند مسلمان فروش چُن لئے تھے۔ ان کو اس طرح سدھایا جیسے شکار کے لیے کتّے سدھائے جاتے ہیں۔ انکے گلوں میں رنگ رنگ کے پٹے ڈالے۔ اور گدیوں پر بٹھایا۔ یہ کتّے شاندار سرکاری کُتّے کہلواتے اور خوشی کے جشن مناتے تھے۔ ان کتّوں ہی کی غرّاہٹ کے لئے آپکے گوشت ہڈیاں نوچیں اور ان کے پلّوں کے لئے سکول اور کالج بنوائے انگریزی طرز و روش کے سکولوں کالجوں میں ان پلّوں کو اصلی انگریز زادہ پلّے بنا دیا۔ اور یہ ایسے سدھے کہ عوام کو جھنجھوڑنے بھنبھوڑنے کے علاوہ ان کو اور کچھ کام ہی نہیں ان کی موجودہ وضع قطع۔ ان کے کردار ان کی گفتار انگریز کی سکھائی ہوئی بھوں بھوں ہے ساری دنیائے اسلام کی ذلّت کے لئے انگریز نے ان کو مفت خوری کی لذّت سکھائی تھی۔ کیونکہ ان کے داداؤں ناناؤں نے ہندوستان کے سر سے اسلام کا سایہ اُٹھانے میں برطانوی شیطان کی مدد کی تھی جن کے ذریعے ٹرینیڈ فادرز یعنی پادریوں کی تعلیم سے بردہ فروشی کی منڈی برطانوی بھک منگوں کے ہاتھ آئی تھی ان دیسی دلّالوں نے پردیسی دجّالوں کے پیچھے میں وہ نیم براعظم تھما دیا تھا۔ جس پر اسلام اور مسلمانوں کا ہزار صد سالہ اقتدار اور وقار آفتاب کی مانند روشنی بخش تھا انگریزوں کے کھائے ہوئے چاولوں کی بیج دلالی کا آغاز تھا۔ ان ہی نے کالی دیوی کے پجاریوں کے مسلم کُش ناخُنوں کو ملت مظلومہ کے حلق کی نالی اور قلب و جگر میں جما دیا تھا اگر آپ کو بتایا جائے کہ بنگال کے سراج الدولہ۔ میسور کے سلطان ٹیپو۔ روہیل کھنڈ کے حافظ رحمت خاں نے فقط آپ کی بقائے جان و ایمان پر جانیں نچھاور کر ڈالی تھیں احیائے سلطنت اسلامی

کی خاطر جہاد و قتال میں شہید ہوئے تھے۔ اور یہ بھی پوچھا جائے۔ کہ ان شہیدوں سے خفیہ بغاوت کرنے والے کون تھے۔ تو کیا آپ بتا سکینگے۔ بالاکوٹ میں سیّد احمد اور اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھی غازی شہیدان اسلام کو سکھوں کے ہاتھوں ذبح کرانے والے کون تھے۔ پنجاب میں راج کریگا خالصہ کی برچھاگردی کے مقابل مسلمانوں کو نامردی کی ترغیب دینے والے کون تھے۔؟

سندھ۔ متوسط ہند۔ گجرات۔ اور دکن میں برطانویوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا گلا دبانے والے کون تھے۔ کون تھے۔ اپنے اپنے ظروف میں مسلمانوں کا خون بھر بھر خود پینے اور دوسروں کو پلاکر انعام سے سُرخرو ہونے والے؟ کون تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ناکام رکھنے کے لئے گوروں سے سازباز رکھتے تھے کون تھے وُہ عفریت جن کے حوصلے پر چند گورے ہم کروڑوں کو کاٹے نگر ([illegible]) کے نام سے اپنے جوتے صاف کرانے کے لئے دست درازی دکھاتے رہے۔

یہ وُہ تھے۔ جن کی ذریت آج پاکستان کے اندر بہشت میں ہے جنت میں آیائیں عورتوں کی بُتی اور دیسی میم صاحباؤں کی خدمت کے لئے مرد بیروں کا ہجوم۔ کوٹھی کے کمروں میں صاحب بہادر کا ایک پورا سیٹ الگ دوسرا سیٹ کالی کلوٹی پوڈر زدہ میم صاجبہ بہادرنی کا سیٹ چھوٹے صاحب اور چھوٹی صاجبنی کے اور ننھے بابا لوگ کے لئے بھی سیٹ۔ اور مس بے بی کے لئے الگ سیٹ ہمارے دیسی انگریزی صاحب بہادر اور دیسی انگریزنی صاجبہ بہادرنی میم جی کے لئے الگ الگ ڈرائنگ روم جنرل اور ڈرائنگ رُوم سپیشل۔ سٹڈی رُوم بھی الگ ہوں تو شان زیادہ ہے ایک کبڈی رُوم جس میں دیسی صاحبان اور صاجبیاں بھنگڑے ڈالیں جنکا انگریزی نام ہے

بال رُوم اَیٹی کویٹ یہ ہے کہ مہمانوں میں ایک میم دوسری میم کے صاحب کے ہاتھ
بغلوں میں دئے سینے ملائے ہوئے ناچیں کودیں۔

بڑے سیٹ کے معنی ہیں سیٹنگ۔ سنگار رُوم بناؤ سنگار کے سامانوں کے ساتھ
بھرا پڑا۔ الگ الگ باتھ رومز جن کے اندر پاپنگاہ اَور واش بیسن۔ دونوں شاور گرم
رواں دواں خاص شرط یہ کہ لوٹا رکھنے کی جگہ قطعاً نہ ہو۔ بہرحال کموڈ کے قریب کی
دیوار پر گھومتی چرخی پر کاغذ کا گولا گھومے۔ کیونکہ خواص الناس کا فضلہ خارج کرنے
والی جگہ اس کاغذ ہی سے رگڑی جانی چاہیے۔ فقط اس لئے کہ تپلون کی میانی خراب نہ
ہو۔ ایسے ہر سیٹ کے کمروں میں فرنیچر انگریز صاحب بہادر کے فرنیچر سے بڑھا چڑھا
مگر ہو اُسی رنگ ڈھنگ کا۔ ریڈیو گرام ضرور ہو۔ ٢٧ سیٹ کے کیا کہنے۔

مَنٹیل پیس پر یعنی آتش دان کے اوپر جسے یہ لوگ کارنس کہتے ہیں۔ چند برہنہ
عورتوں کے چھوٹے چھوٹے بُت اور نیم برہنہ صدر و سینہ و گردن کی تصویریں بت چھوٹے
چھوٹے ننھے منّے جانور کے بنے ہوئے جنہیں میڈان انگلینڈ ثبت ہو۔ بخس جانوروں کے
مجسمے سُوئر کے شکار کا منظر۔ ایک کُتّے ایک خرگوش کا تاکہ صاحب بہادر اور صاحبہ بہادرنی
کو اپنے اپنے کردار کے پیش نظر ہمیشہ ان کو دیکھتے رہنے کا ناز و فخر کا احساس رہے
ننگی ناچتی ہوئی میم کا مجسمہ ہو تو ونڈرفُل۔ ویری بیوٹی فُل۔ شیشے دار الماریوں
میں دھات کے بھی اور سفید مٹی یا کسی اور مرکّب کے بُت بھی ہونے چاہئیں۔ اور کسی نہ کسی پر
میم اپنے پستان کی تصویر کھول کر لیٹی ہوئی تو لازمۂ صاحب بہادری ہے۔ ان کمروں کے باہر
ورانڈے اہا۔ پھر سامنے کے لان کیا کہنے۔ چارمنگ ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا میدان
جس میں ٹینس کھیلنے کا پورا سامان ایرہ ایرہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہے بہشت اپنے دوزخ کی
صورت آپ خود جانچیں۔
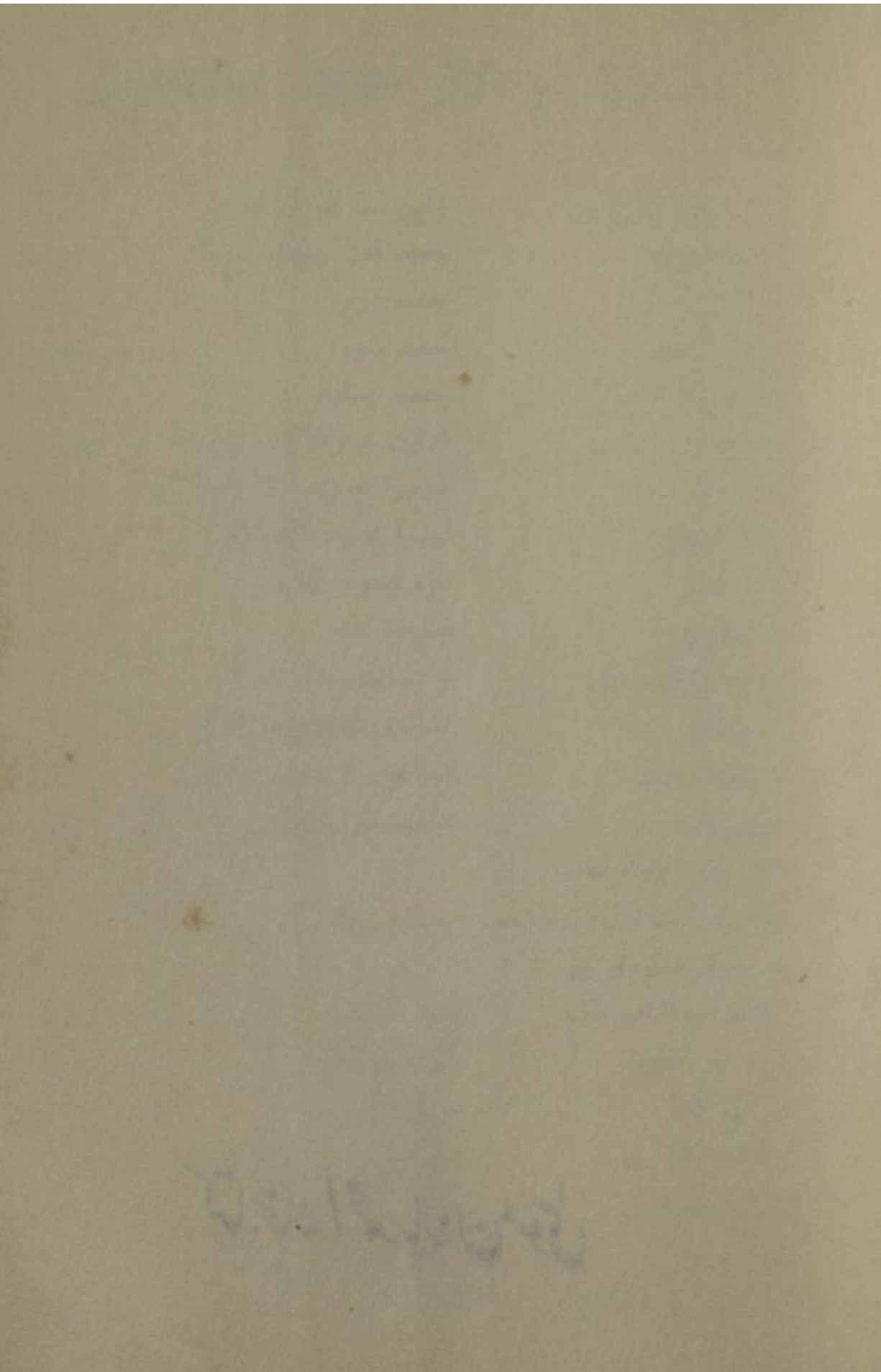
تصانیف ابو الاثر حفیظ جالندھری

بلال استقلال لاہور	(نئی معرکہ آرا نظم)	۱۰.۰۰
شاہنامہ اسلام	حصہ اول چھپائی آفسٹ	۷.۵۰
شاہنامہ اسلام	حصہ دوم	۷.۵۰
شاہنامہ اسلام	حصہ سوم	۷.۵۰
شاہنامہ اسلام	حصہ چہارم	۷.۵۰
نغمہ زار	اولین مجموعہ کلام (مجلد)	۸.۰۰
سوز و ساز	دوسرا مجموعہ کلام (مجلد)	۱۲.۰۰
تلخابہ شریں	تیسرا مجموعہ کلام (مجلد)	۱۵.۰۰
چراغِ سحر	تازہ مجموعہ کلام	۱۵.۰۰
بزم نہیں رزم	مجموعہ کلام	۵.۰۰
انتخاب دیوان حالی	از دیباچہ حفیظ (مجلد)	۶.۰۰
ہفتِ پیکر	افسانوں کا مجموعہ (مجلد)	۶.۰۰
معیاری افسانے	افسانوں کا مجموعہ (مجلد)	۶.۰۰
چیونٹی نامہ	شگفتہ نثر حفیظ	۷.۵۰
حفیظ جشن پنجاہ سالہ		۲.۵۰
حفیظ کے گیت اول، دوم، سوم، چہارم بچوں کے لیے	فی حصہ	۲.۰۰
مصر عہدِ فاروق سے جمال عبدالناصر تک	نصیر احمد	۸.۰۰
سپاہی کے خطوط	صوبیدار انوار	۵.۰۰
میں نے کہا	عزیز ملک	۳.۰۰
زیر نقاب کیا ہے ؟	عزیز ملک	۵.۰۰
اُڑتے ہوئے خاکے	سید ضمیر جعفری	۸.۰۰
رسولِ عربی ؐ	پروفیسر جی - ایس دارا	۶.۰۰
سکیکی میر جز (انگریزی)	ڈاکٹر عباسی	۶.۰۰

برسرِ راہِ مدینہ